جولائی ۱۹۷۸ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

مرتب
شیخ جمیل الرحمٰن

جلد ۲۷	ماہ جولائی ۱۹۷۸ء	شمارہ ۷

مشمولات

- عرض احوال — — — ڈاکٹر اسرار احمد صفحہ ۱
- صراط مستقیم (نشری تقریر) — — ” ” ” ” ۵
- شرک اور اقسام شرک (۸) — — ” ” ” ” ۹
- اہل سنت اور نظریہ امامت — — مولانا محمد اسحاق صدیقی ” ۳۲
- محمد ابن جریر طبری — — — محترمہ جمیلہ شوکت صاحبہ ۵۰
- ”کل من علیہا فان“ — — — ڈاکٹر اسرار احمد صفحہ ٦٦
- ضمیمہ متعلقہ پروگرام درس قرآن !

شائع کردہ :

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

۳٦ - کے ، ماڈل ٹاؤن ، لاہور
فون : 352683

چندہ سالانہ -/[illegible] — قیمت فی پرچہ [illegible]

تعلیم دعاء

اعجاز نبوی کا آئینہ

از قلم : مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

ادعیہ ماثورہ کا عظیم خزینہ

صفحات ۴۰ - سفید کاغذ آفسٹ طباعت ہدیہ ۵۰ / ۱

دعوت اسلامی

تاریخ کے آئینے میں

از قلم : مولانا وصی مظہر ندوی

ریڈیو جدہ (سعودی عرب) سے نشر شدہ پندرہ تقاریر

صفحات ۱۱۲ - سفید کاغذ آفسٹ طباعت ہدیہ ۵۰ / ۴ روپے

ڈاکٹر اسرار احمد

کا ایک پرتاثیر خطاب

نبی اکرم سے ہمارے تعلق کی بنیادیں

بڑا سائز صفحات ۴۸ - سفید کاغذ آفسٹ طباعت ہدیہ ۵۰ / ۱

ملنے کا پتہ : مکتبہ تنظیم اسلامی

۳۶ - کے ماڈل ٹاؤن - لاہور

ڈاکٹر صاحب موصوف کا ایک اہم خطاب

شرک اور اقسام شرک

زیر طبع

اسرار احمد

عرضِ احوال

مولانا امین احسن اصلاحی کے ایک خط کا ذکر گزشتہ شمارے میں محترم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کر چکے ہیں۔ شیخ صاحب موصوف نے اس ضمن میں ایک خط مولانا اصلاحی کے نام لکھنا شروع کیا تھا، جس کی اشاعت فی الحال روک دی گئی ہے، کچھ اس سبب سے کہ شدتِ احساس کے باعث وہ طویل بہت ہو گیا اور کچھ اس بنا پر کہ رفقاء و احباب کی اکثریت کی رائے یہ سامنے آئی کہ اس معاملے میں کسی بحث یا ردّ و قدح سے حتی الامکان گریز کیا جائے ـــــ بہرحال ہم متذکرہ بالا خط اور اُس کے مُصنّف اور اُس کو 'صحیفۂ آسمانی' کے سے انداز میں طبع کرانے اور 'مبلغانہ جوش و خروش' کے ساتھ ملک کے طول و عرض میں تقسیم کرنے والوں کے بارے میں اپنے 'حقِ جواب' کو فی الحال محفوظ رکھتے ہیں۔ البتہ ذیل میں وہ تین خطوط شائع کئے جا رہے ہیں جن کا تبادلہ اسی موضوع پر مولانا اصلاحی اور مولانا سیّد وصی مظہر ندوی کے مابین ہوا۔ ـــــ مولانا ندوی بھی سردار محمد اجمل خان لغاری کی طرح ہمارے بزرگوں اور مولانا اصلاحی کے خُوردوں میں سے ہیں۔ سردار صاحب کو اپنی "اصلاحِ ذاتُ البَین" کی سعیٔ مسعود کا صلہ اصلاحی صاحب کی جانب سے "جعلسازی" کے الزام کی صورت میں ملا تھا۔ (یہ دوسری بات ہے کہ جب سردار صاحب نے اصلاحی صاحب کو ع "جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی؟" کے حوالے کے ساتھ لکھا کہ آپ کا خط میرے پاس محفوظ ہے تو مولانا موصوف نے خط و کتابت بند کر دینے ہی میں عافیت سمجھی!) اب دیکھئے کہ مولانا ندوی کو اِس گواہی کی کیا قیمت ادا کرنی پڑتی ہے کہ اواخر ۷۵ء تک مولانا کو ان سطور کے عاجز و ناکارہ راقم پر صرف دو اعتراض تھے (ایک کم علمی یا بے علمی کا جو صد فی صد درست ہے اور دوسرا یہ کہ "یہ اپنے جلسوں میں بھانت بھانت کے مولوی جمع کرتا ہے"ـــ جس کی جانب توجہ کرنی چاہیے اُن "مولویوں" کو جو اصلاحی صاحب کے خط کی طباعت و اشاعت مذہبی فریضے کی طرح کر رہے ہیں!) اور یہ 'عظیم' اعتراضات بھی صرف اس درجے میں تھے کہ ان کے باوصف راقم کے حق میں مولانا کے محبت آمیز رویے اور مشفقانہ و مُربیانہ طرزِ عمل میں (کم از کم ظاہر کی حد تک) کوئی فرق نہ پڑا تھا!

مکتوب مولانا ندوی بنام مولانا اصلاحی

تاریخ ۲۹ مئی ۱۹۷۸ء بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

محترم المقام جناب مولینا امین احسن اصلاحی صاحب مُدّ ظلّہٗ!

السّلام علیکم ورحمۃ اللّٰہ وبرکاتہٗ!

اِن سُطور کا راقم آنجناب کو اُستاد اور مُربّی تصوّر کرتا ہے۔ اِس عاجز نے نہ صرف آپ کی بیش قیمت کُتب سے استفادہ کیا ہے، بلکہ قبل تقسیم و بعد تقسیم تیس تیس یوم کی تربیت گاہوں میں بھی آپ کے زیرِ تربیت رہا ہے۔ جماعتِ اسلامی کی مجالسِ شوریٰ میں آنجناب سے طویل عرصے تک کچھ نہ کچھ سیکھتا ہی رہا ہے۔

مذکورہ بالا الفاظ لکھنے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ آپ کا یہ شاگرد اور زیرِ تربیت آج نہایت دردمندی اور دلسوزی سے آپ کے اس تازہ خط کے بارے میں اپنے کچھ تأثرات نہایت ادب سے پیش کرنا چاہتا ہے جو آپ نے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے بارے میں لکھا ہے۔

اگر آپ اجازت دیں تو عرض کروں کہ اس خط کے پڑھنے والے یا تو مخالفِ دین ہوں گے یا دین کے ماننے والے۔ مخالفِ دین اس کو پڑھ کر ایک اور خندۂ اِستہزاء کے ساتھ گذر جائیں گے کہ دین بجائے خود چونکہ نعوذ باللّٰہ غلط اور مفادات کے حصول کا ذریعہ ہے، اور حاملینِ دین اسی طرح ایک دوسرے کے خلاف دُشنام بلب و شمشیر بکف ہوا ہی کرتے ہیں۔

اور اگر اس خط کے پڑھنے والے، دین کے ماننے والے ہوں گے تو پھر اُن میں سے کچھ وہ ہوں گے جو ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے ناواقف یا کم واقف ہوں اور آپ کی رائے پر اُن کو بالکلیہ اعتماد ہو تو وہ بلا تحقیق آپ کی رائے کے مقلّد بن کر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے بارے میں اُسی رائے کے قائل ہو جائیں گے جو آپ نے ظاہر فرمائی ہے۔

اس خط کے پڑھنے والے بعض ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہوں اور آپ کے علم و فضل کے بھی معتقد ہوں وہ ایک عجیب مخمصہ میں مبتلا ہو جائیں گے اُن کی قوّتِ عمل مفلوج ہو جائے گی اور وہ اس وقت دین کا کوئی کام نہ کر سکیں گے جب تک کہ آپ دونوں کے بارے وہ کسی فیصلہ

پر نہ پہنچ جائیں۔

اس خط کے پڑھنے والے بعض ایسے حضرات بھی ہو سکتے ہیں جو ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ساتھ انتہائی حسنِ ظن رکھتے ہوں۔ لیکن آپ کے علم و فضل اور مقام و مرتبہ سے ناآشنا ہوں، وہ یہ خط پڑھ کر آپ کے بارے میں سوءِ ظن میں مبتلا ہو جائیں گے۔

اسی طرح اس خط کے بعض پڑھنے والے وہ ہو سکتے ہیں جو آپ سے اور ڈاکٹر اسرار احمد صاحب، دونوں سے ناواقف ہوں۔ وہ ہر دو اصحاب کے بارے میں ایک تذبذب کا شکار ہو جائیں گے۔

غرضیکہ آپ جس پہلو سے دیکھیں اس خط کی افادیت نہایت مشکوک، اور ضرر انتہائی یقینی نظر آتا ہے ـــــ اس کے برخلاف آپ نے جن خدشات کا اظہار فرمایا ہے اُن کی نشاندہی کرنے والی علامات کا اگر تفصیلی تذکرہ ہوتا تو پھر آنجناب کے خط سے جو شخص بھی کوئی رائے قائم کرتا، علیٰ وجہ البصیرت کرتا ـــــ مجھے آپ کے ساتھ جو حسنِ ظن ہے اُس کی بنا پر مجھے کامل یقین ہے کہ آپ کسی بھی معاملہ میں کسی شخص سے اپنی رائے تقلیداً منوانے کے خواہاں نہیں ہو سکتے۔ پھر خدا معلوم آپ نے کیوں اس اختصار کے ساتھ اپنا فیصلہ تو سُنا دیا لیکن اسبابِ فیصلہ کو "محفوظ" رکھا۔

بہر حال اب مجھ جیسے عقیدت مندوں کا آپ پر یہ حق ہے کہ آپ نے ڈاکٹر صاحب کے بارے میں جن خدشات کا اظہار فرمایا ہے، اُن کے بارے میں آپ واضح فرمائیں کہ :-

(۱) اِن خدشات کی بنیاد کن قولی اور عملی شہادتوں پر رکھی گئی ہے ؟

(۲) یہ خدشات اوّلاً آپ نے کب محسوس فرمائے اور کب اُن کے بارے میں آپ کی یہ رائے پختہ ہوئی ؟ [تاکہ آپ نے ڈاکٹر صاحب کے "تزکیہ" اور حُسنِ کردار و گفتار کے بارے میں وقتاً فوقتاً جو اظہارِ خیال فرمایا ہے، اُن کی تاریخوں اور خدشات کے استحکام کی تاریخ کا فاصلہ اور تناسب معلوم ہو سکے !]

(۳) ڈاکٹر اسرار احمد صاحب آپ کے پاس آتے جاتے رہے اور آپ کی شاگردی کا تأثر عام کرتے رہے۔ کیا آپ نے اپنے اِن خدشات کا کبھی اُن سے بھی اظہار کیا ؟ اگر کیا تو کب ؟

اُمید ہے کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔ والسّلام

احقر وصی مظہر ندوی مہتمم مدرسہ جامعہ اسلامیہ ٹھنڈی سڑک حیدر آباد ۔

رحمان آباد
۶ جون ۷۸ء

مکرمی و محبی زاد لطفہٗ — السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

عنایت نامہ موصول ہوا۔ یاد آوری کا شکریہ، یاد فرمائیے کتنا زمانہ گزرا جب آپ اور ڈاکٹر اسرار میرے پاس گاؤں میں مجھ سے ملنے آئے تھے۔ اُس وقت ڈاکٹر اسرار کو الگ کر کے مجھ سے تنہائی میں آپ نے کہا کہ مجھے ڈاکٹر اسرار کے متعلق کچھ بتاؤ کہ میں فیصلہ کر سکوں کہ اُن سے تعاون کرنا چاہیئے یا نہیں، اور کرنا چاہیئے تو کس حد تک۔ میں نے فوراً آپ کو جواب دیا کہ جب ڈاکٹر صاحب یہاں موجود ہیں تو انہیں بھی بُلا لیجئے۔ میں اُن کے مُنہ پر آپ کو اُن کا سارا احوال بتا دوں گا تاکہ آپ اُن سے آگاہ بھی ہو جائیں اور غیبت بھی نہ ہو۔ لیکن آپ اس کے بعد خاموش ہو گئے، نہ اُن کو اندر بُلایا اور نہ پھر مجھ سے سوال کیا۔ مجھے آپ کے اس رویّے پر بڑا تعجب ہوا، لیکن میں اِس وجہ سے خاموش رہا کہ آپ اپنے مصالح کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ اگر آپ اس وقت اپنے سوال کا جواب سُن لیتے تو آج اِن سوالوں کی نوبت نہ آتی جو آپ نے کئے ہیں۔

میرا اور ڈاکٹر صاحب کا جھگڑا بہت پُرانا ہے۔ آپ کو نہ معلوم ہو تو نہ ہو لیکن بہتوں کو معلوم ہے۔ اِس کے پبلک میں نہ آنے کی وجہ یہ تھی کہ بیچ کے کچھ لوگوں نے ڈاکٹر صاحب کی طرف سے معافی اور اصلاح کے وعدہ کی بنا پر مجھ سے خواہش کی تھی کہ میں اخباروں میں کوئی اعلانِ برأت نہ کروں لیکن ڈاکٹر صاحب نے خود اس کو بالکل غلط رنگ میں پبلک میں پیش کیا، جس کے سبب سے لوگوں کے سوالات میرے پاس آ رہے ہیں اور میں مجبور ہوں کہ اُن کو جواب دُوں، جس طرح آپ کو جواب دے رہا ہوں۔ خط میں پوری داستان نہیں لکھی جا سکتی۔ اس وجہ سے اگر آپ تفصیل چاہتے ہوں تو زحمتِ سفر اُٹھائیے اور یہاں آ کر سُنئے۔ میں آپ کو بتا دوں گا کہ ڈاکٹر صاحب کے متعلق میں نے جو رائے قائم کی ہے، اُس کے وجوہ کیا ہیں؟ اور اگر سفر نہیں کر سکتے تو صبر کیجئے میں ضروری مواد جمع کرا رہا ہوں، اِن شاء اللہ جلد آپ کے سامنے سارا ماجرا آ جائے گا۔ میرے خط سے متعلق آپ نے جن اندیشوں کا اظہار کیا ہے، آپ اُن سے فکرمند نہ ہوں، اِن شاء اللہ اس سے نہایت عمدہ نتائج نکلیں گے اور اگر کچھ کسر رہ گئی تو میرے آئندہ مضمون سے خدا نے چاہا تو پوری ہو جائے گی۔ اِس عاجز کے متعلق آپ نے جس حُسنِ ظن کا اظہار کیا ہے اُس کیلئے دل سے شکر گزار ہوں۔ والسلام

امین احسن اصلاحی

ڈاکٹر اسرار احمد

صراطِ مستقیم (نشری تقریر)

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ط
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

سورۂ یونس کی آیات ۵۰ تا ۵۳ کا ترجمہ یہ ہے: "(اے نبی! صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے کہیے کبھی تم نے اس پر بھی غور کیا کہ اللہ کا عذاب خواہ دن کے وقت آئے خواہ رات کو آخر وہ ایسی کون سی چیز ہے جس کے لئے مجرم جلدی مچائیں، تو کیا جب وہ آفت واقع ہو ہی جائے گی تب تم مانو گے؟ (اس وقت تو صاف کہہ دیا جائے گا) کیا اب ایمان لاتے ہو؟ حالانکہ پہلے تم خود اس کے لئے جلدی مچاتے رہے! اس وقت ظالموں کے کان کھول دیئے جائیں گے۔ اب چکھو ہمیشہ کے عذاب کا مزہ! تمھیں بدلہ ملے گا اسی کمائی کا جو تم کرتے رہے تھے! اور آپ سے (بن بن کر) پوچھتے ہیں: "کیا یہ واقعی شدنی امر ہے؟" کہہ دیجیے: "ہاں، مجھے اپنے رب کی قسم ہے یہ واقع ہو کر رہے گا اور تم کسی طرح بھی اسے روک نہیں سکتے!"

یہ بات اصولی طور پر سمجھ لینی چاہیئے کہ جب بھی کوئی رسول کسی قوم یا قریہ کی طرف مبعوث ہوا اس نے لوگوں کو توحید، آخرت اور رسالت پر ایمان لانے کی دعوت دی اور ساتھ ہی یہ خبر بھی دی کہ اگر تم نے اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کیا تو نہ صرف یہ کہ تم آخرت کے ابدی و سرمدی عذاب میں مبتلا ہو گے۔ بلکہ اس دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ تمھیں نیست و نابود کر کے رکھ دے گا۔ اس لئے کہ جب رسول قولاً و عملاً دعوت و تبلیغ کا حق ادا کر دے اور قوم پر پوری طرح حجت قائم کر دے اور اس کے باوجود وہ قوم ایمان نہ لائے تو گویا وہ اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر دیتی ہے کہ اس میں حق کو قبول کرنے کی استعداد و صلاحیت اور اصلاح پذیری کا مادّہ ہی سرے سے باقی نہیں رہا۔ گویا اب اس کی حیثیت جسدِ انسانی کے ایسے عضو کی ہے جو بالکل گل سڑ گیا ہو اور اسے کاٹ کر پھینک دینا ہی پورے

جسم کی عافیت کے لئے لازمی ہوگیا ہو۔ اب ظاہر ہے کہ آخرت کے عذاب کا معاملہ تو ہے ہی قیامت کے بعد کا، خود دنیا میں ہلاکت و بربادی کی سزا یا عذابِ استیصال بھی اس وقت آتا ہے جب رسول کو تبلیغ کا فریضہ ادا کرتے ہوئے ایک مدّت گزر چکی ہے لہٰذ قوم پر اتمامِ حجّت کا حق ادا ہوجاتا ہے۔ اس درمیانی عرصے کے دوران رسولوں کے مخالفین و معاندین عذاب کی اس دھمکی کو تمسخر و استہزاء اور طعن و طنز کا موضوع بنا لیتے ہیں اور جیسے جیسے وقت گزرتا ہے ان کی ڈھٹائی اور جسارت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور اس قسم کے فقرے بھی ان کی زبانوں سے نکلنے لگتے ہیں کہ "کہاں ہے وہ تمہارا عذاب؟" "آخر وہ آکیوں نہیں جاتا؟" "ہم تو تمہاری تکذیب کر چکے، اب اس عذاب میں کیوں دیر ہوری ہے؟" اور "تمہاری دھمکیاں سنتے سنتے ہمارے کان پک گئے ہیں اور تمہاری اس خالی خولی دھونس سے ہم تنگ آ چکے ہیں، اگر تم واقعی سچے ہو تو پھر دیر مت کرو اور وہ عذاب لے آؤ!" چنانچہ آیاتِ سابقہ میں اُن کے بعض ایسے ہی جملے نقل بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً آیت ۴۸ میں فرمایا: "اور یہ لوگ کہتے ہیں آخر اس دھمکی کا ظہور کب ہوگا؟" اور آیت ۴۹ میں جواباً کہلوایا: "ہر امّت کی مہلت کے خاتمے کا ایک وقت معیّن ہے جب وہ وقت آجاتا ہے تو گھڑی بھر کی بھی نہ تاخیر ہوسکتی ہے نہ تقدیم!" اسی ضمن میں ذرا ہی پہلے آیت ۴۶ میں آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو خطاب کر کے یہ بھی فرمایا جا چکا ہے کہ: "(اے نبیؐ!) یہ بھی ممکن ہے کہ جس عذاب کی دھمکی ہم انہیں سنا رہے ہیں اس کا کچھ حصّہ آپ کو بھی دکھا دیں۔ یعنی آپ کی حیاتِ دنیوی کے دوران ہی وہ عذاب اُن پر نازل ہوجائے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم آپ کو وفات دے دیں اور عذابِ موعود اس کے بعد نازل ہو!" ——— اب آیاتِ زیرِ بحث میں فرمایا جا رہا ہے کہ وہ عذاب رات کے وقت آئے یا دن کے وقت، اُس سے آخر کیا فرق واقع ہوتا ہے۔ سوچنے کی بات تو یہ ہے، اُس سے بچا کیسے جائے اور تلافیٔ مافات کے ذریعے رحمتِ خداوندی کو کیسے پکارا جائے؟ معلوم ہوتا ہے کہ کسی بدبخت نے اسی تمسخر و استہزاء کے انداز میں کہا ہوگا کہ ——— : "کیوں جی! وہ آپ کا عذاب کب آئے گا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ رات کے وقت تشریف لے آئے اور ہم اُس کا شایانِ شان استقبال بھی نہ کر سکیں!" ——— جواب میں بڑے حسرت آمیز انداز میں فرمایا کہ عذاب دن کو آئے یا رات کو، یہ بدبخت یہ نہیں سوچتے کہ جس کی جلدی اپنی نادانی و جہالت میں مچائے

ہوئے ہیں وہ ہے کس درجہ خوفناک اور بھیانک چیز! جب وہ مصیبت آدھمکے گی تو یہی لوگ جو اس وقت غرور اور تکبّر میں اس درجہ بڑھ گئے ہیں کہ رسول اور اللہ کے غلام کا مذاق اڑانے سے بھی باز نہیں آتے، چلّا چلّا کر کہیں گے کہ ہم ایمان لے آئے اور گڑگڑائیں گے کہ کسی طرح انہیں اس عذاب سے چھٹکارا دلادیا جائے۔ اس وقت کہا جائے گا کہ اب ایمان لانا قطعاً مفید نہیں۔ اب تو جس چیز کی جلدی تم مچا رہے تھے، اُس کا مزہ چکھو اور یہ ہرگز تم پر ظلم یا زیادتی نہیں ہے بلکہ ٹھیک ٹھیک بدلہ اور اجر و جزا ہے تمہارے اعمال کی گویا تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے جو تمہارے سامنے آرہی ہے۔

آخری آیت میں ایک عجیب حقیقت بیان ہوئی ہے اور وہ یہ کہ ان میں سے بعض نسبتاً جری لوگ بعض مواقع پر طنز و استہزاء کے انداز کو چھوڑ کر بظاہر پوری سنجیدگی سے اور گویا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا کرتے تھے کہ: "اے محمدؐ! کیا واقعی جو تم کہہ رہے ہو، سچ ہے اور جن باتوں کی تم خبر دے رہے ہو وہ واقعی پیش آنے والی ہیں؟" — اُن کا یہ انداز دراصل ایک دو دھاری تلوار کے مانند تھا جس سے ایک جانب تو وہ اپنے عوام کو یہ باور کراتے تھے کہ ہمارے یہ سردار اور سردھرے اس معاملے میں پوری طرح سنجیدہ ہیں اور واقعتاً حقیقت ہی کے متلاشی ہیں اور محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کی دعوت کے بارے میں انہیں حقیقی شکوک و شبہات لاحق ہیں! اور دوسری جانب وہ خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایک نفسیاتی حربہ آزماتے تھے کہ اس طرح آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دوٹوک سوال کرنے سے ممکن ہے کہ آنحضورؐ کی قوّتِ ارادی کو توڑنے یا کمزور کرنے میں کامیابی حاصل ہو جائے۔ ان کے اس حربے کا ذکر وضاحت کے ساتھ سورۂ ن یا سورۂ قلم کے آخر میں ہوا ہے کہ: "وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ" یعنی اُن کافروں کی تو یہی کوشش ہے کہ متزلزل کر دیں آپ کو (اے نبیؐ!) اپنی نگاہوں سے"۔ ان کے اس حربے کا جواب اس مقام پر ترکی بہ ترکی دلوایا گیا ہے کہ (اے نبیؐ! آپ پوری طرح ڈٹ کر اور کامل وثوق و یقین کے ساتھ) جواب دیں کہ یقیناً مجھے اپنے پروردگار کی قسم ہے کہ یہ کلام بھی برحق ہے جو میں پیش کر رہا ہوں اور وہ واقعات و حوادث بھی بالکل حتمی اور یقینی —— شدنی اور اٹل ہیں جن کی میں خبر دے رہا ہوں اور اچھی طرح کان کھول کر میرا چیلنج سُن لو کہ تم نہ مجھے میرے مشن میں ناکام کر سکو گے، نہ اس کلام

کا مقابلہ کر سکو گے جسے میں پیش کر رہا ہوں اور ان حالات و واقعات کی رفتار روک سکو گے جو تمہارے کفر و تکذیب اور اعراض و انکار کے باعث حرکت میں آ چکے ہیں — اس ضمن میں یہ حقیقت ذہن میں مستحضر رکھنی چاہیئے کہ جب قرآن حکیم میں مستقبل میں پیش آنے والے حالات و واقعات کے ضمن میں کوئی بات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حلفیہ و قسمیہ کہلوائی جاتی ہے تو اس کی پشت پر اصل دلیل آنحضورؐ کی مسلّمہ صداقت و امانت اور آپؐ کی بے داغ سیرت و کردار کی ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ وہ ذات مطہّر و مقدّس جس نے کبھی کسی انسان کی طرف کوئی جھوٹی بات منسوب نہ کی، کیا وہ خدا پر جھوٹ جڑے گا اور اس شدّ و مدّ کے ساتھ کہ اس پر اسی کی قسم بھی کھائے گا؟ اسی کی ایک مثال سورۃ تغابن میں ہے۔ وہاں پہلے یہ فرمایا کہ:- "زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا" یعنی کافروں کو یہ مغالطہ لاحق ہو گیا تھا کہ انہیں مرنے کے بعد دوبارہ نہ اٹھایا جا سکے گا!" اور پھر آنحضورؐ کو حکم ہوا: قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۭ وَذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرٌ "کہہ دیجیے اے نبی! کیوں نہیں، میں اپنے رب کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم لازماً اٹھائے جاؤ گے اور پھر تمہیں لازماً جتلا دیا جائے گا جو کچھ کہ تم نے کیا ہو گا — اور یہ سب اللہ کے لیے بہت آسان ہے!"

ظاہر ہے کہ مستقبل کے واقعات خواہ وہ اس دنیا سے متعلق ہوں خواہ آخرت سے، انسان کو بچشمِ سر تو نہیں دکھلائے جا سکتے۔ ان کا مشاہدہ تو یا تو بچشمِ عقل و قلب ممکن ہے — یا پھر کسی چشم دید گواہ کی گواہی کے اعتماد پر! اسی لئے اللہ تعالیٰ نبیوں اور رسولوں کو ملکوتِ ارض و سماء کا مشاہدہ کراتا ہے اور عالمِ غیب کی سیر کراتا ہے تاکہ وہ لوگوں کو جو خبر دے وہ پورے وثوق اور یقین کے ساتھ دے اور کسی جھٹلانے والے کا جھٹلانا یا بچلانے والے کا بچلانا اس پر مؤثر اور کارگر نہ ہو سکے۔ گویا ع "پیمبر ہر چہ گوید دیدہ گوید!" — فَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا

قسط ۸

ڈاکٹر اسرار احمد

شرک اور اقسامِ شرک

شرک فی الحقوق (۳)

(ترتیب وتدوین: جمیل الرحمٰن)

اجتماعی دائرہ | میں نے اختصار کے ساتھ انفرادی زندگی کے چند پہلوؤں کا ذکر کیا ہے۔ اب آیئے! ہم جائزہ لیں اور دیکھیں کہ اجتماعی زندگی میں شرک حقوق اللہ یعنی عبادتِ ربّ پر کس کس طرح ڈاکے ڈالتا ہے۔

اجتماعیات کا دائرہ بہت ہی وسیع ہے۔ اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ممکن نہیں لہٰذا میں اس دائرے میں سے چند اہم امور پر گفتگو کروں گا

حاکمیّت | عبادتِ ربّ کا اہم ترین تقاضا اور مطالبہ "اطاعت" وضاحت کے ساتھ ہمارے سامنے آچکا۔ محبّت و شوق کے جذبے پر آگے تفصیلی گفتگو ہوگی۔ اطاعت کے ذیل میں سرفہرست حاکمیّت کا مسئلہ زیرِ گفتگو آئے گا۔ چونکہ اجتماعاتِ انسانی میں فی الوقت سب سے اونچا تصوّر حاکمیّت (SOVEREIGNTY) کا تصوّر ہے، اور اس کے بعد ہے ریاست (STATE) کا تصوّر۔ پچھلی دو تین صدیوں قبل ذہنِ انسانی صرف حکومت (GOVERNMENT) کے تصوّر سے واقف تھا لیکن موجودہ دور میں ذہنِ انسانی نے حاکمیّت اور ریاست اور حکومت میں امتیازات قائم کیے ہیں اب فلسفۂ اجتماعیات میں حاکمیت و ریاست مستقل نوع کی حامل ہیں جبکہ حکومت ایک عارضی اور متبدّل چیز ہے، آنی جانی شے ہے۔ خود اپنے ملک میں دیکھ لیجیے کہ کتنی پارٹیوں اور اشخاص کی حکومتیں آئیں اور گئیں۔ پھر امریکہ، فرانس اور برطانیہ اور متعدّد ممالک میں

تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد پارٹیوں کی یا اشخاص کی حکومتیں بدلتی رہتی ہیں، اور یہ حکومتیں اپنی اپنی پارٹیوں کے یا اشخاص کے نام سے موسوم ہوا کرتی ہیں جیسے لیبر پارٹی کی حکومت یا کنزرویٹو پارٹی کی حکومت، ری پبلکن پارٹی یا ڈیموکریٹو پارٹی کی حکومت یا صدر ایوب کی حکومت، جنرل یحییٰ کی حکومت، پیپلز پارٹی کی حکومت وغیرہم۔ لیکن جو ریاست (STATE) ہے، وہ قائم و دائم ہے جیسے ریاستِ پاکستان، ریاستِ متحدہ امریکہ، ریاست فرانس، اور ریاستِ برطانیہ۔

ریاست کے تصوّر کا اوّلین تقاضا یہ ہوتا ہے کہ یہ طے کیا جائے کہ اس ریاست میں بنیادی طور پر حاکمیت (SOVEREIGHTY) کا اختیار کس کو حاصل ہے۔ ریاست کا آخری مقتدرِ اعلیٰ کون ہے، کس کا حکم اور فیصلہ قطعی اور آخری درجہ رکھتا ہے۔ حاکمیّت کے ضمن میں قرآن مجید کا فیصلہ یہ ہے کہ انسانی حاکمیّت مطلقہ کا تصوّر کسی صورت میں بھی تسلیم کر لیا جائے، وہ صریح شرک ہے۔

دنیا میں حاکمیّت کے مختلف ادوار میں مختلف نظریات رہے ہیں، نیز انکی نوعیّت بھی مختلف رہی ہے۔ آسمانی ہدایت سے بے نیاز و آزاد تصوّرِ حاکمیت دراصل نظریہ اور روح کے اعتبار سے خالص شرک ہے جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا۔ اس شرک کی بھی دو بڑی بڑی قسمیں دنیا میں رائج رہی ہیں۔ ایک سیاسی شرک اور دوسرا مذہبی شرک پھر ان دونوں قسموں کی بھی علیحدہ علیحدہ بہت سی اقسام ہیں جن میں سے چند پر میں قدرے تفصیلی اشارات پیش کروں گا۔

سیاسی شرک سیاسی شرک کی بھی دو قسمیں ہیں پہلی یہ کہ کسی ملک میں کسی ایک فرد کو حاکمِ مطلق (SOVEREIGN) مان لیا جائے، یہ ہے ملوکیّت یا بادشاہت۔ اسی کی دوسری شکل آمریّت (DICTATERSHIP) ہے۔ دوسری یہ کہ کسی ملک کے رہنے والے تمام لوگ مل جل کر حاکمیّت (SOVEREIGNTY) کے مدّعی ہوں۔ یہ ہے جمہوریّت۔ ملوکیّت و بادشاہت کا شرک بھی قدیم ہے اور جمہوریّت کا بھی۔ اگرچہ ان کے لحاظ سے مختلف ادوار میں مختلف رہے ہیں۔ نیز جمہوریّت کا شرک دورِ جدید میں زیادہ نمایاں ہے اور اس وقت دنیا میں یہ بہت ہی مقبول ہے۔ لیکن اس کا تصوّر بطورِ فلسفہ بہت قدیم ہے اور اس فلسفے کے ڈانڈے افلاطون اور ارسطو جیسے یونانی فلاسفہ کے افکار

سے ملتے ہیں۔

مُلوکیّت | ملوکیّت اور بادشاہت میں مَلِک اور بادشاہ یا اُس کے جانشین اس بات کے مدّعی ہوتے ہیں کہ چونکہ حکومت کے اسباب و وسائل بلاشرکتِ غیرے ان کے ہاتھوں میں ہیں لہٰذا ملک میں اُن کی مرضی، قانون کا درجہ رکھتی ہے۔ چند صدیوں قبل عملاً بھی یہی ہوتا تھا کہ بادشاہ کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون اور حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ لوگوں کی جان و مال اور آبرو پر جس طرح چاہتا تھا، تصرّف کرتا تھا۔ زمانہ قدیم میں جو لوگ بہت ہی خودپسند ہوتے تھے، وہ خدائی کا دعویٰ بھی کر بیٹھتے تھے اور جو یہ دعویٰ کرنے میں کچھ تأمّل کرتے تھے وہ یا تو اپنا شجرۂ نسب کسی دیوی دیوتا سے قائم کرتے تھے یا خود کو خدا یا دیوی دیوتاؤں کے نمائندے بنا کر مختارِ کل ہونے کی حیثیت سے خصوصی اور تقدّس مآب اختیارات (DIVINE RIGHTS OF KING) کے مدّعی ہوتے تھے اور خود کو ظلِّ الٰہی بنا کر پیش کرتے تھے۔ خدائی کے مدّعی خودپسند لوگ نشۂ حکومت میں ہمیشہ انبیاء و رُسُل کی دعوتِ عبادتِ ربّ کا انکار کرتے رہے ہیں۔ جیسا کہ فرعون کے بارے میں قرآن مجید میں متعدّد مقامات پر اس کے دعویٰ خدائی کے تذکرے میں موجود ہے۔ جس کی تہہ میں دراصل اس کو مصر میں مطلق العنان بادشاہت اور ملک کے تمام وسائل پر کُلّیۃً اختیارات حاصل ہونے کا عامل (FACTOR) کارفرما تھا۔ مثلاً سورۃ الزّخرف میں اسی کا واضح طور پر یوں تذکرہ کیا گیا: وَنَادٰی فِرْعَوْنُ فِیْ قَوْمِهٖ قَالَ یٰقَوْمِ اَلَیْسَ لِیْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ (آیت ۵۱) - [اور فرعون نے اپنی قوم سے علی الاعلان کہا کہ میری قوم! کیا مصر کی حکومت میرے ہاتھ میں نہیں ہے؟ اور یہ نہریں جو میرے زیرِ انتظام بہہ رہی ہیں (وہ میری نہیں ہیں؟) کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟] — اور سورۃ القصص میں ہے: وَقَالَ فِرْعَوْنُ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرِیْ (آیت ۳۸) - [اور فرعون نے کہا کہ اے عمائدین! میں اپنے سوا تمہارے لئے کسی اور کو الٰہ (معبود و حاکم) نہیں جانتا] وہ اسی نشۂ حکومت سے بدمست ہو کر حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السّلام کی دعوتِ عبادت و اطاعتِ ربّ کے متعلق چِڑ چِڑا کر پوچھتا تھا: قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا یٰمُوْسٰی (طٰہٰ ۴۹) اور: قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (الشعراء ۲۳) - پھر اسی حکومت کے نشے میں

بادشاہِ وقت (نمرود) نے حضرت ابراہیم علیہ السّلام سے جو مُحاجّہ کیا تھا وہ سورۃ البقرہ میں بایں الفاظ مذکور ہے: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ ؕ (۲۵۸) — ملک کا مطلق العنان بادشاہ ہونے کی وجہ سے نمرود اس زعم اور گھمنڈ میں مبتلا تھا کہ اُسے لوگوں کی جانوں پر تصرّف حاصل ہے، وہ جس کو چاہے قتل کرا دے جس کی چاہے جاں بخشی کر دے۔ اسی معنی میں وہ خدائی کا مدّعی تھا۔ ایسے خدائی کے مدّعیان دراصل کائنات کے خالق ہونے اور انتظام و انصرام پر متصرّف ہونے کے دعویدار نہیں ہوتے تھے بلکہ اپنی سلطنت اور حکومت میں مختارِ کُل ہونے کی وجہ سے خود کو خدا (ربّ) خیال کرتے تھے۔ اور اپنی رعیّت کی اطاعت و وفاداری کو صرف اپنے لئے خاص سمجھتے تھے، اور انہوں نے اپنی تعظیم و تکریم کے اظہار کے لئے مراسمِ عبودیّت بھی مقرّر کر رکھے تھے۔

جمہوریّت جمہوریّت کا اصل الاصول یہ ہے کہ کسی ریاست کے رہنے والے حاکمیّتِ کلّی کے مقام پہ فائز ہیں اور وہ اکثریّت کی بنیاد پر حکومت کے تمام معاملات چلانے کے مجاز ہیں۔ وہ اپنی رائے سے اولی الامر کا انتخاب کریں گے۔ چاہے وہ پارلیمانی طرزِ حکومت ہو یا صدارتی نظامِ حکومت ہو، اکثریّت سے منتخب ہونے والے ایوانِ حکومت کے ارکان، عوام کے نمائندگان کی حیثیّت سے اپنی حکومت تشکیل دیں گے اور حاکمیّت کے اختیارات استعمال کریں گے اور قانون سازی اور اس کی تنفیذ کے وہ کُلّی طور پر مجاز ہوں گے۔ ایوانِ حکومت کی اکیاون فی صد آراء کی مدد سے جو قانون بنے گا وہ گویا عوام النّاس کی مرضی کا مظہر ہوگا۔ قانون سازی میں کسی آسمانی ہدایت کی کوئی ضرورت اور پابندی خارج از بحث ہوگی۔ اکیاون فی صد ارکانِ پارلیمان یا کانگرس چاہیں تو شراب و قمار بازی کو جائز قرار دے دیں، چاہیں ناجائز۔ چاہیں تو عُریانی پر قدغن لگا دیں چاہیں تو اس کو مادر پدر آزاد قرار دے دیں۔ جیسا کہ اکثر مغربی ممالک اور امریکہ کی ریاستوں میں اس شیطانی عمل کو قانون کا تحفّظ حاصل ہے، اور ایشیا و افریقہ کے اکثر ممالک بھی ان کی اندھی تقلید کر رہے ہیں۔ یہ لوگ چاہیں تو زنا اور لواطت جیسے مکروہ فعل کو بھی سندِ جواز دے دیں۔ الغرض ان کے لئے کوئی تہدید نہیں، کوئی پابندی نہیں، چونکہ وہ اکثریّت کے نمائندے ہیں اور اکثریّت کو مقامِ حاکمیّتِ مطلقہ (ABSOLUTE

SOVEREIGNTY) حاصل ہے۔ لہٰذا اکثریت کی خواہشات کی تکمیل ہی اُن کا فرضِ منصبی ہے۔ یہ نظریۂ فکر اور عمل کے لحاظ سے قطعی شرک ہے۔ عقلِ سلیم اس بات کو نہیں مان سکتی کہ اگر ایک جرم کوئی فردِ واحد کرے تو وہ جرم ہو اور جب اسی جرم کا اکثریت ارتکاب کرے تو وہ جرم نہ ہو۔ ایک شخص شراب پیئے تو جرم اور اگر سب مل کر پئیں تو وہ جرم نہیں۔ کوئی منطق اس کو درست قرار نہیں دے سکتی۔ لہٰذا چاہے ملوکیت (DIVINE SOVEREIGNTY) کا تصور ہو چاہے حاکمیتِ انسانی (HUMEN SOVEREIGNTY) کا تصور و نظریہ یعنی وہ چاہے ایک فردِ واحد (بادشاہ) کی حاکمیت سے متعلق ہو یا ملک کے عوام الناس (جمہور) کی حاکمیت سے۔ یہ دونوں نظریات و تصورات اپنی روح اور عمل کے لحاظ سے خالص شرک ہیں، اور شرک ہونے کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں۔ قرآن مجید کا فیصلہ تو یہ ہے کہ اکثریت عموماً گمراہ اور خواہشاتِ نفس کی تابع ہوتی ہے۔ جس کے چند حوالے اس مقام پر ذہن نشین کر لیجئے۔

اکثریت اور قرآن مجید | سورۂ یوسف کی یہ آیت میں آپ کو ابتدا ہی میں سنا چکا کہ: وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُونَ ○ (آیت ۱۰۶): "اور اُن میں سے اکثر اللہ کو مانتے ہیں مگر اس طرح کہ اس کے ساتھ دوسروں کو بھی شریک ٹھہراتے ہیں!"۔ سورۃ المائدہ میں فرمایا: قُل لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ ج "(اے نبیؐ) کہہ دیجئے کہ ناپاک چیزیں اور پاک چیزیں برابر نہیں ہوتیں۔ اگرچہ ناپاک چیزوں کی کثرت تمہیں بھلی لگے!"۔ سورۂ حدید میں اہلِ کتاب کے قلوب کی سختی کا ذکر فرماتے ہوئے آیت کے آخر میں فرمایا: وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ ○ (آیت ۲۶): "اور ان میں اکثریت فاسقوں کی ہے!"۔ یہی بات اسی سورۂ مبارکہ کی آیت ۲۶ کے آخر میں فرمائی جس سے قبل حضرت نوح، حضرت ابراہیم علیہما السلام اور ان کی اولاد میں نبوت اور انزالِ کتب کے سلسلے کو جاری رکھنے کی اللہ کی سنت کا ذکر فرمایا گیا۔ پھر اسی سورہ میں خاص طور پر نصاریٰ کا ذکر کرتے ہوئے ستائیسویں آیت کے آخر میں بھی یہی ارشاد فرمایا: وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ ○ ۔ سورۃ المائدہ کی آیت ۴۹ میں پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے اس تاکیدی حکم کا ذکر فرمایا جو انبیاء و رُسل اور اُن کے توسط

سے اُن کی اُمتوں کو دیا جاتا رہا ہے کہ فیصلے اس ہدایت وحکم کے مطابق کرنا جو اللہ نے نازل فرمایا ہے پھر اُمتوں کی رُوگردانی اور سرکشی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: وَاِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ٥ — سورۃ الانعام کی ایک سو انیسویں آیت کے آخر میں فرمایا: وَاِنَّ کَثِیْرًا لَّیُضِلُّوْنَ بِاَھْوَآءِھِمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ اِنَّ رَبَّكَ ھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِیْنَ ٥ : "اور لوگوں کی اکثریت بے سمجھے بوجھے اپنی خواہشاتِ نفس سے لوگوں کو بہکاتی ہے۔ بلاشبہ ایسے لوگوں سے جو (خدا کی مقرر کردہ) حد سے باہر نکل جاتے ہیں (اے نبی!) آپ کا ربّ خوب واقف ہے!" — سورۃ الانعام میں فرمایا:

وَاِنْ تُطِعْ اَکْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ یُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ ھُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ ٥ (آیت ۱۱۶)

اور (اے نبی!) اگر آپ نے زمین پر بسنے والی اکثریت کی (جو گمراہ ہیں) بات مانی تو وہ لوگ آپ کو اللہ کی راہ سے بچلا دیں گے۔ یہ لوگ محض گمان کے پیچھے چلتے اور نرے اٹکل کے تیر چلاتے ہیں۔

حاکمیّتِ مطلقہ کا قرآنی نظریہ

ملوکیت وجمہوریت کے شرک ہونے کے متعلق مَیں نے جس رائے کا اتنے وثوق اور اتنے شدّ ومدّ سے اظہار کیا ہے، وہ میرے ذاتی غور وفکر کا نتیجہ نہیں بلکہ بالکلیّہ نصُوصِ قرآنی پر مبنی ہے۔ اس لئے مَیں چاہتا ہوں کہ آگے بڑھنے سے قبل ان نصوصِ قرآنیہ کو اسی موقع پر پیش کردوں۔

کسی ہستی کی حاکمیّت کے تسلیم کرنے کے لئے جو عوامل ضروری ہیں۔ ان میں تخلیق، تدبیر، ربوبیّت، ملکیّت، حکومت اور مختارِ کُل ہونے کے عوامل اساسی حیثیّت رکھتے ہیں۔ اب دیکھئے کہ ان اُمور و عوامل کے لحاظ سے کائناتی حاکمیت ہی نہیں بلکہ سیاسی وتشریعی حاکمیّت کا ازرُوئے قرآن اصل استحقاق صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔

تخلیق

سورۃ الاعراف کی آیت ۵۴ کے آخر میں قاعدہ کلیّہ کے طور پر فرمایا کہ: اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ٥ (خبردار! خلق اسی کی ہے اور امر بھی اُسی کا ہے۔ اللہ ربّ العالمین بڑا ہی بابرکت ہے) — ہٹ دھرمی کی بات اور ہے ورنہ عقلِ سلیم اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ اس کائنات کی جو ہستی بھی

مالک اور ربّ ہے اور جو اپنی ذات میں یکتا و بے ہمتا اور اپنی صفات میں بدرجۂ اتم واکمل ہے اور وہی ہستی صاحبِ امر ہونے کا استحقاق رکھتی ہے۔ مشرکینِ مکّہ بھی جنہوں نے کعبۃ اللہ میں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے، اس حقیقتِ کبریٰ کے قائل تھے۔ سورۃ العنکبوت میں فرمایا:

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝ (آیت ۶۱)

اور اگر ان (مشرکین) سے پوچھو آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا اور سورج اور چاند کو کس نے زیرِ فرمان کیا؟ تو کہیں گے اللہ نے! تو پھر کہاں بہکے جا رہے ہو؟

یہی بات سورۂ لقمان کی آیت ۲۵ میں اور الزمر کی آیت ۳۸ میں یوں ارشاد فرمائی: وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۭ پھر اسی کو مزید مؤکّد کر کے سورۂ الزخرف میں یوں فرمایا:

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۙ (آیت ۹)

اور اگر ان (مشرکین) سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کا خالق کون ہے؟ تو یہ کہیں گے کہ اُن کو اُس (اللہ) نے پیدا کیا ہے جو غالب و علیم ہے!

تخلیق خالص اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا ظہور ہے۔ اس میں کسی شبہ اور شک کی گنجائش نہیں۔ اس حقیقت کو قرآن مجید میں مختلف اسالیب سے بیان کیا گیا ہے کہیں فرمایا: هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ (التغابن) کہیں فرمایا: وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ۭ (الفرقان) کہیں فرمایا: هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۭ (البقرہ) کہیں فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ۭ (الانعام)

تدبیر و ربوبیّت تخلیق کا لازمہ تدبیر و ربوبیّت بھی ہے۔ اللہ ہی وہ ہستی ہے جو کائنات کی تخلیق کے بعد اس کی تدبیر و ربوبیّت فرما رہا ہے۔ وہ ایسی ہستی نہیں ہے کہ جو اپنی مخلوق سے تخلیق کے بعد بے تعلّق ہو گئی ہو۔ بلکہ وہی ربّ العٰلمین اور مدبّرِ کائنات ہے۔ چنانچہ کائنات کی تخلیق کا مختلف ادوار میں ذکر فرماتے ہوئے

سورۂ یونس کی تیسری آیت کے شروع میں فرمایا :

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ	بلاشبہ تمھارا پروردگار ہی اللہ ہے، جس نے
وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ	آسمان اور زمین چھ ایّام (ادوار) میں بنائے
اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ	پھر وہ تختِ (حکومت) پر متمکن ہوا۔ وہی

(اللہ) ہے جو تمام کاموں کا انتظام و انصرام کرتا ہے!

سورۃ السجدہ کی چوتھی آیت میں کائنات کی چھ ایّام (ادوار) میں تخلیق، اس کی ربوبیّت اور استوٰی علی العرش کا ذکر کرنے کے بعد پانچویں آیت میں فرمایا :— یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ط۔ چنانچہ رات اور دن کا اختلاف، موسموں کا تغیر و تبدل، بارشوں کا نظام، مردہ زمین سے روئیدگی اور فصلوں کا مختلف مراحل سے گزرنا۔ یہ چوپائے اور چرند و پرند، یہ ہواؤں کے چلنے کا انتظام، یہ مختلف گیسوں کا امتزاج و ارتباط، اللہ کی ربوبیّتِ کاملہ کے مظاہر ہیں۔

مالک الملک | حکومت کے لئے "حقیقی اختیار" ضروری ہے، جس میں پہلے تو ملکیّت زیرِ بحث آئے گی۔ چنانچہ اس لحاظ سے قرآنِ حکیم کا مطالعہ کیجئے تو یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آجائے گی کہ اس کائنات کا حقیقی (D-FACTO) مالک بھی اللہ ہے اور مالک ہونے کا استحقاق (D-JURE) بھی اسی کو حاصل ہے۔ بطورِ دلیل صرف چند آیات ملاحظہ کیجئے۔ سورۃ البقرہ میں فرمایا :

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ	کیا تمھیں معلوم نہیں کہ آسمانوں اور زمین
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَمَا لَكُمْ	کی بادشاہت صرف اللہ ہی کی ہے، اور اللہ
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ	کے سوا تمھارا کوئی حامی و مددگار نہیں۔
(آیت ۱۰۷)	

سورۂ آلِ عمران میں اُس کے شہنشاہِ ارض و سماء ہونے کا نہایت پُرجلال اسلوب سے یوں اعلان فرمایا :

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی	(اے نبی) کہہ دیجئے کہ خدایا ملک کے مالک
الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ ط وَتَنْزِعُ	(حقیقی)، تو جسے چاہے بادشاہی عنایت فرما دے
الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ط وَتُعِزُّ مَنْ	اور جس سے چاہے چھین لے، اور جس کو چاہے عزّت

تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۪ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۪ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ؕ (آیات ۲۶-۲۷)

دے اور جسے چاہے ذلیل کرے۔ تیرے ہاتھ میں بھلائی ہی بھلائی ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ تو ہی رات کو دن میں داخل کرتا اور تو ہی دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔ تو ہی بے جان سے جاندار اور جاندار سے بے جان پیدا کرتا ہے، اور تو ہی جس کو چاہتا ہے بے شمار و بے حساب رزق عطا کرتا ہے۔

پھر اسی سورۂ آل عمران کی آیت ۱۸۹ میں فرمایا:

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ؕ

اور اللہ ہی کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے!

اللہ تعالیٰ کے مالک الملک ہونے کے سلسلے میں متعدد آیات ہیں، جن میں سے میں نے صرف تین کا اب تک حوالہ دیا ہے۔ چند آیات اور سن لیجئے۔ سورۃ التغابن کا شاہانہ اور پر جلال آغاز اسی حقیقت کے اظہار کے لئے، یوں ہوتا ہے:

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ ۫ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ؕ

جو چیز بھی آسمانوں میں ہے اور جو چیز بھی زمین میں ہے، ہر چیز اللہ کی تسبیح کرتی ہے۔ اسی کی بادشاہی (حقیقتاً بھی اور بطورِ استحقاق بھی) ہے اور اسی کا (لامتناہی شکر) اسی کی تعریف و ثنا ہے، اور وہی ہے جو ہر چیز پہ قادر ہے!

سورۃ الملک کا آغاز ان پُر جلال الفاظ سے ہوتا ہے:

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ۫ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ؕ

وہ (اللہ) جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے بڑی ہی بابرکت ہستی ہے۔ اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے

سورۃ البروج میں فرمایا کہ اللہ آسمانوں اور زمین کا بادشاہ ہی نہیں بلکہ ہر چیز کا بذاتِ خود نگراں بھی ہے: اَلَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى

كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝ (آیت ۹)

سورۃ الفرقان کی دوسری آیت اور سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیت شرک فی الذات، شرک فی الصفات اور شرک فی العبادت (شرک فی الحقوق) کی تردید میں براہین قاطع کا درجہ رکھتی ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیت کے متعلق کتبِ احادیث میں حضرت کعب احبارؓ سے جو اسلام لانے سے پہلے یہودی تھے اور تورات کے جیّد عالم بھی۔ یہ قول منقول ہے کہ اسی مضمون کی آیت تورات کی آخری آیت تھی یعنی اسی مضمون پر تورات ختم ہوتی تھی — سورۂ فرقان میں فرمایا:

الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا ۝ (آیت ۲)

وہ (اللہ) ہی ہے جس کے لئے آسمانوں اور زمین کی (حقیقی) بادشاہی ہے اور اس نے (کسی کو) بیٹا نہیں بنایا اور اسی نے ہر چیز کو پیدا کیا، پھر اس کے کام کے لئے ایک اندازہ ٹھہرایا۔

سورۂ بنی اسرائیل کے آخر میں فرمایا:

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيرًا ۝ (آیت ۱۱۱)

اور (اے نبی) کہہ دیجئے کہ تمام شکر و سپاس اور تمام تعریف و ثنا صرف اللہ ہی کے لئے ہے جس نے نہ تو کسی کو بیٹا بنایا ہے اور نہ اُس کی بادشاہی (حکومت و اختیارِ مطلق) میں کوئی شریک ہے، نہ اس وجہ سے کہ وہ (اللہ) عاجز و ناتواں ہے۔ اُس کا کوئی حامی اور دوست نہیں ہے، اور دراصل کبریائی اُسی کو زیبا ہے۔ پس اُس کی کبریائی کا اعلان بھی کرو اور اس کو قائم کرنے کی جدّ و جُہد بھی کرو جیسا کہ اُس کی کبریائی کا حق ہے۔

اِن آیات کے حوالے سے واضح ہوگیا کہ مالک الملک درحقیقت اللہ ہی ہے اور اس کے سوا جو بھی چاہے وہ فردِ واحد ہو، چاہے جمہور ہوں کسی ریاست کے مالک و مختار ہونے کے علی الاطلاق مدّعی ہوں تو ان کا یہ دعویٰ شرک ہے، اللہ سے بغاوت اور سرکشی ہے۔

احکم الحاکمین پس جب ثابت ہوگیا کہ مالک الملک درحقیقت اللہ ہی ہے تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہوا کہ احکم الحاکمین بھی اسی کی ذاتِ تبارک وتعالیٰ ہوسکتی ہے ملک اس کا، اور بادشاہت اس کی تو حکومت کا حق بھی اس کا، حاکم اور مقتدرِ اعلیٰ بھی وہی، مقنّن بھی وہی — اس سے انکار کفر ہے، فسق ہے، ظلم ہے، شرک ہے۔ وہ ذات خیرالحاکمین بھی ہے اور احکم الحاکمین بھی — اس وسیع و عریض کائنات کا حاکم علی الاطلاق (THE ABSOLUTE SOVEREIGN) اسی کی ذاتِ یکتا اور بے ہمتا ہے

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

حکومت حاکمیتِ مطلقہ صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے، قرآنِ حکیم میں اس بات کو بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے اور اس کے لئے مختلف اسالیب اختیار کئے گئے ہیں کہ جس کی وجہ سے اس معاملے میں قطعی کسی شک وشبہ گنجائش باقی نہیں رہتی۔ میں چاہتا ہوں کہ قرآنِ حکیم کے چند مقامات سے اس موقع پر چند حوالے اور دے دوں تاکہ شرک فی العبادت اور شرک فی الحقوق کی گفتگو مزید مؤکد ہوجائے — سورہ انعام میں مشرکینِ مکہ کے عذاب کی تعجیل کے جواب میں نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے کہلوایا گیا۔

قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ یَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ ۝ (آیت ۵۷)	(اے نبی) کہہ دیجئے! میں تو اپنے ربّ کی روشن دلیل (کے مطابق حق) پر ہوں اور تم اس کی تکذیب کرتے ہو۔ جس چیز (عذاب) کی تم جلدی مچارہے ہو (اس کا اختیار) میرے پاس نہیں ہے۔ حکم (حکومت کا اختیار) توصرف اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور وہ حق بات ہی بیان فرماتا ہے اور وہ (اللہ) فیصلہ کرنے والوں میں سب سے بہتر ہے۔

اسی سورۂ مبارکہ میں آگے فرمایا:

ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَی اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ؕ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۫ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِیْنَ ۝ (آیت ۶۲)	پھر (قیامت کے دن) سب لوگ اللہ کی طرف واپس بلالئے جائیں گے جو (کائنات کا) حقیقی آقا (مولیٰ) ہے۔ آگاہ ہو حکم (حقیقی حکومت صرف) اسی کا حق ہے اور وہ نہایت جلد حساب لینے والا ہے۔

ان آیات سے یہ مغالطہ لاحق ہوسکتا ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ کی تکوینی حاکمیت کا ذکر ہے۔ سیاسی اور تشریعی حاکمیت مراد نہیں ہے، لہٰذا سورۂ یوسف میں اس کو کھول دیا گیا کہ الحکم سے اللہ تعالیٰ کی سیاسی و تشریعی حکومت بھی مراد ہوتی ہے۔ میں اس پوری آیت کا عبادت کے موضوع پر گفتگو کے وقت حوالہ چکا ہوں۔ اب اسی آیت میں اللہ تعالیٰ کی سیاسی و تشریعی حاکمیت کے ذیل میں تمام علمائے ربانی کی رائے کے مطابق جو نصّ وارد ہوتی ہے، اس کو بھی پورے طور پر سمجھ لیجئے فرمایا:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا	حکم (حکومت و فیصلے) کا اختیار صرف اللہ
تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ	ہی کے لئے ہے۔ اُسی کا فرمان ہے کہ تم صرف
الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ	اُسی کی (غلامی) عبادت کرو۔ سیدھا اور
لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (آیت ۴۰)	درست صحیح دین (نظام اطاعت و زندگی)
	یہی ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس (سیاسی اور تشریعی حاکمیت) کا علم نہیں رکھتے۔

یہاں کوئی قرینہ ایسا نہیں ہے، جس سے ثابت ہو کہ اس مقام پر فرماں روائی اور حاکمیت سے جو لفظ الحکم کے معانی و مفاہیم میں شامل ہے، صرف کائناتی حکومت مراد ہے بلکہ یہاں لفظ الحکم کا عموم اور اس کے ساتھ خالص اللہ کی عبادت یعنی بندگی کا فرمان (امر) اور دین القیّم یعنی صحیح نظام اطاعت و نظامِ حیات کا ذکر فرما کر واضح کر دیا گیا کہ یہاں دراصل الحکم سے اللہ کی سیاسی و تشریعی فرماں روائی اور حاکمیت مراد ہے۔

سورۃ القصص میں لفظِ "الحکم" اس بلاغت و فصاحت سے بیان ہوا ہے کہ جو تکوینی و تشریعی حاکمیت دونوں مفاہیم و معانی پر محیط ہے، فرمایا:

وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ	اور وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی بندگی اور
الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ	غلامی کے لائق نہیں۔ دنیا اور آخرت میں بھی
وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝	شکر و سپاس اور تعریف و ثنا اسی کے لئے
(آیت ۷۰)	ہے اور الحکم (حاکمیت و اختیار) صرف اسی کا
	ہے۔ اور اسی کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے۔

حِلّت و حُرمت کسی شے اور کسی کام کو حلال و حرام اور جائز و ناجائز قرار دینے کا اختیار سیاسی و قانونی حاکمیت کے لوازم و مقتضیات میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا

واضح کیا گیا کہ یہ اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، فرمایا :

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ۝
(النحل ۱۱۶)

اور نہ کہا کرو وہ جھوٹ جو تمہاری زبانوں پہ آجاتا ہے کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے تاکہ اللہ پہ بہتان باندھنے لگو۔ بے شک جو لوگ اللہ پہ بہتان باندھتے ہیں وہ کبھی بھی فلاح نہیں پا سکتے ؟

سورۂ یونس میں فرمایا :

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ۝
(سورہ یونس ۵۹)

(اے نبی !) کہہ دیجیے کہ تم لوگوں نے کبھی اس پہ بھی غور کیا کہ جو رزق تمہارے لئے اللہ نے اتارا تھا اُس میں سے تم نے بعض کو حرام ٹھیرایا اور بعض کو حلال۔ ان سے پوچھو کیا اللہ نے تم کو اس کی اجازت دی تھی ؟ یا تم (اپنی رائے سے) اللہ پہ بہتان باندھ رہے ہو!

ہر اجتماعی نظام میں انسان کی کمائی اور اُس کے خورد و نوش کی چیزوں میں حرمت و حلت کا مسئلہ بنیادی نوعیت کا ہوتا ہے۔ ابھی میں نے جن آیات کا حوالہ دیا ہے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اختیار خاص اللہ کے لئے ہے۔ اور یہی اس کی حاکمیتِ مطلقہ کے لئے دلیلِ قاطع ہے۔

اللہ تعالیٰ کی سیاسی و تشریعی حکومت کی فرماں برداری کی صورت کیا ہوگی ؟ اس کو سورۃ الاعراف کی اس آیت میں واضح کیا گیا :

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝
(آیت ۳)

پیروی کرو اس (ہدایت) کی جو تمہارے آقا اور پروردگار کی طرف سے تم پہ نازل کی گئی ہے، اور اسے چھوڑ کر اپنے (بنائے ہوئے) کارسازوں کی پیروی نہ کرو۔ (لیکن) تم میں سے بہت کم ہیں جو یاد دہانی حاصل کرتے ہیں۔

سیاسی حاکمیت | اب تک میں نے جن آیات کا حوالہ دیا ہے وہ مکی دور کی سورتوں کی آیات ہیں، جہاں ایمان لانے والے مغلوب تھے۔ اُن کو سیاسی قوت حاصل نہیں تھی لہٰذا اجتماعی دائرے میں وہ اللہ کے قانون کی تنفیذ پر قادر نہیں تھے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے مدینہ میں مسلمانوں کو تمکّن عطا فرمایا اور مدینہ کی یہ اسلامی ریاست بتدریج وسعت اختیار کرتی چلی گئی تو ضروری ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی سیاسی و تشریعی اور قانونی حاکمیت کے اجمال کو بالکل واضح کر دیا جائے۔ چنانچہ مدنی دور کی سورتوں میں حسبِ موقع اس ضمن میں واضح اُصول اور ہدایات دی جاتی رہی ہیں۔ پہلی اُصولی بات کو سورہ بقرہ کی آیت ۲۵۶ میں فرمایا: فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ — جو طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا۔ اُس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں اور سب کچھ سننے والا اور سب کچھ دیکھنے والا ہے!

اسی سورت میں اگلی آیت (۲۵۷) میں فیصلہ فرما دیا کہ کفّار درحقیقت طاغوت کے دوست ہیں: وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ۔ اس سے قبل سورۂ نحل میں فرمایا گیا تھا:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ (آیت ۳۶) — اور ہم نے بلاشبہ ہر اُمّت میں رسول بھیجا (تو اس رسول نے یہی دعوت دی) کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی بندگی سے اجتناب کرو!

سورۃ النّساء (مدنی) میں تو یہ مسئلہ بالکل صاف کر دیا کہ تحکیم کا حق اللہ تعالیٰ کو ہے اور اس سے مراد سیاسی و قانونی تحکیم ہے۔ جس کا ذریعہ، وسیلہ اور واسطہ اللہ کی کتاب (قرآن) اور اللہ کے رسولؐ کی سُنّت (حدیث) ہے۔ فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ — (اے نبیؐ!) کیا آپ نے اُن لوگوں کو دیکھا جو دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ وہ جو (کتاب) آپ پر نازل ہوئی اور جو (کتابیں) آپ سے پہلے نازل ہوئیں اُن سب پر ایمان رکھتے ہیں لیکن چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کے تنازعات کے

وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا (آیت ۶۰)

طاغوت کے پاس فیصلوں کے لئے جائیں حالانکہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ اُس (طاغوت) کا کفر کریں اور شیطان (تو یہ) چاہتا (ہی) ہے کہ اُن کو بہکا کر برگشتہ اور گمراہ کردے اور راہِ حق سے بہت دُور لے جائے۔

اِس آیتِ کریمہ میں "بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ" سے مراد قرآنِ حکیم ہے۔ جس کے متعلق کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ يَتَحَاكَمُوْٓا سے مراد متنازع فیہ معاملات کا تصفیہ ہے۔ طاغوت سے کفر کرنے کا حکم جن آیات میں وارد ہوا ہے اُن میں سے چند کا ذکر میں کرچکا۔ البتہ طاغوت سے کیا مراد ہے اِس کی میں آگے وضاحت کروں گا۔ اِس موقع پہ اس بات کو بھی اچھی طرح جان لیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے معاملات کے فیصلوں کے لئے رسول کو بھی مختار کیا ہے۔ چونکہ رسول جو فیصلے کرتا ہے وہ اُس بصیرتِ باطنی کی وجہ سے کرتا ہے جو اُسے نبوّت کی وجہ سے حاصل ہے۔ لہٰذا اُس کے فیصلوں کی پشت پہ اللہ تعالیٰ کی سلطان (SANCTION) موجود ہوتی ہے — رسول کے فیصلوں کو ماننا اور فرض تسلیم کرنا ضروری ہے۔ دلیل کے لئے اسی سورۂ مبارکہ آیت ۶۵ سنئے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ط

پس نہیں، تیرے ربّ کی قسم، یہ لوگ ہرگز مؤمن نہیں ہیں۔ جب تک اپنے تمام تنازعات میں آپ ہی کو حَکَم نہ مانیں اور جو کچھ آپ فیصلہ کریں اس پر دل میں کوئی تنگی محسوس کئے بغیر اس کو قبول نہ کریں اور دل کی پوری آمادگی اور خوشی کے ساتھ اس کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کریں۔

طاغوت | اب آئیے لفظِ طاغوت کے معانی و مفاہیم کو قرآن مجید ہی سے سمجھیں۔ قرآن مجید فرقانِ حمید عربی مبین میں نازل ہوا ہے اور اُس کے بے شمار اعجازات میں یہ اعجاز بھی شامل ہے کہ اُس نے اسی زبان کے بعض الفاظ کو اُن کی لُغوی اصل سے ہٹا کر انہیں بطورِ خصوصی اصطلاحات استعمال کیا ہے۔ اور ان میں معانی و مفاہیم کا ایک بحرِ بیکراں سمو دیا ہے۔ پھر ان معانی و مفاہیم کا لغوی اصل سے تعلّق بھی منقطع نہیں ہوتا بلکہ قائم رہتا ہے۔ ایک اصطلاح کا استعمال اس کے تمام تقاضوں کو کہنے والے اور سننے والے کے ذہن میں بیک وقت مستحضر کردیتا ہے۔ جیسے صلوٰۃ، زکوٰۃ، ایمان، اسلام، حکم، عبادت

وغیرہم۔ ان کے استعمال سے ہر اصطلاح کے تمام مطالبات، مقتضیات، متضمنات اور مضمرات سامنے آجاتے ہیں۔ انہی اصطلاحات میں سے ایک طاغوت بھی ہے جو طغیٰ کے مادے (ROUT) سے بنا ہے۔ طغیٰ کے لغوی معنیٰ حد سے تجاوز کرنے کے ہیں۔ جو چیز ایک مناسب حد سے آگے بڑھ جائے تو اس پر اس لفظ کا اطلاق ہوگا۔ اردو زبان میں بھی یہ اسی مفہوم میں مستعمل ہے۔ چنانچہ دریا اور ندی میں جب سیلاب آتا ہے اور پانی حد سے متجاوز ہوتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ طغیانی آگئی۔ اسی طغیٰ کے اصل لغوی مادے سے بروزن ملکوت وجبروت، لفظِ طاغوت بنا۔ جس میں بطورِ اصطلاح عبدیت اور بندگی کی حدود سے نکل جانے کا مفہوم پیدا ہوا۔ لہٰذا ہر وہ چیز، ہر وہ شخص اور ہر وہ ادارہ جو حدودِ عبادت اور بندگیٔ ربّ سے نکل جائے، اور ان حدود سے آگے بڑھے دین کی اصطلاح میں طاغوت قرار پاتا ہے۔ یہ طاغوت شیاطینِ جنّ والنس بھی ہو سکتے ہیں اور اللہ کی اطاعت سے بے نیاز و آزاد تصوّرِ حاکمیّت اور کوئی دوسرا نظریہ وخیال بھی۔ اور ہر وہ شے بھی جس کی اللہ کے سوا پرستش کی جائے۔ اسی لئے اس نظامِ حیات اور طرزِ حکومت کو جس میں کتاب وسُنّت کے دستور وقانون کے مطابق معاملاتِ حکومت چلانے کے بجائے اس سے آزاد ہو کر چلائے جائیں اور اس کے خلاف قانون سازی کی جائے اور اس طرح غیر الٰہی قانون کے تحت اجتماعی معاملات اور تنازعات فیصل ہوں یا جس میں اللہ کے سوا کسی اور کے لئے مراسمِ عبودیّت انجام دیئے جائیں، اس کو طاغوتی نظام کہا جاتا ہے۔

تحاکم اِلَی الطّاغوت میں نے طاغوت کے ضمن میں جو آیات ابھی آپ کو سنائی ہیں اُن پر دوبارہ نگاہ ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ ہر مقام پر طاغوت سے قبل یا مابعد اس کے مقابل کا ذکر کر کے مختلف مفاہیم متعیّن کئے گئے ہیں۔ سورۃ البقرہ میں: فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ کے بعد فرمایا وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ ؕ ۔۔ یہاں واضح ہو گیا کہ طاغوت سے مراد ماسوا اللہ ہے۔ سُورۃ النّحل میں: وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ سے قبل فرمایا: اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ ۔ یہاں واضح ہو گیا کہ اللہ کی بندگی کے علاوہ کسی کی بندگی یا اُس کے ساتھ کسی اور کی بالذّات بندگی، طاغوت کی بندگی ہو گی۔ سورۃ النّساء کی ساٹھویں آیت کے بعد اگلی آیت میں فرمایا کہ: وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ؕ پچھلی آیت میں يَتَحَاكَمُوْٓا

اِلَی الطَّاغُوْتِ فرمایا تھا۔ یہاں مقابلے میں تَعَالَوْا اِلٰی مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ وَاِلَی الرَّسُوْلِ فرماکر واضح کیا گیا کہ طاغوت کتابِ الٰہی اور سُنّتِ رسول کی ضد اور مخالفت کی تعبیر کیلئے ایک جامع اصطلاح ہے ــــ ان تمام تفاصیل سے معلوم ہوا کہ جو چیز خدا کی اطاعت سے نکل جائے یا نکل جانے کا باعث یا ذریعہ ہو، وہ سب طاغوت کے حکم میں ہیں۔ لہٰذا اللہ کی اطاعت کی دعوت کے علاوہ کسی دوسری دعوت کی طرف بلانے والے لیڈر، اللہ کے رسول کی سُنّت سے انکار کرنے والے متجدّدین، غیر الٰہی حکومتیں، غیر الٰہی عدالتیں، غیر الٰہی دارالعلوم اور مدارس، غیر الٰہی خانقاہیں اور سجّادے، غیر الٰہی طور طریقے اور رسوم و رواج غیر الٰہی نظریات (ازم) سب طاغوت کے تحت آتے ہیں۔ اہلِ کتاب کو اسی نوع کے شرک پر سورۃ مائدہ میں عبد الطّاغوت کہا گیا ہے اور اسی نوع کے شرک پر سورۃ النّساء میں منافقینِ مدینہ کو جہنّم کی وعید سنائی گئی اور وہ بھی اُس کے اسفل السّافلین والے حصّے کی: اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِیْرًا ۙ (۱۴۵) — بلاشبہ منافقین دوزخ کے سب سے نچلے حصّے میں ہوں گے اور (اے نبی!) آپ ان کا کسی کو مددگار نہ پاؤ گے۔

منافقین کا شرک غور کیجئے کہ منافقین کا وہ کیا جرم تھا کہ جس کی بنا پر ان کو ایسی سخت وعید سنائی گئی۔ منافقین قانوناً مسلمان شمار ہوتے تھے۔ جہاں تک ظاہری اعتقاد کا تعلّق ہے تو مسلمان ہونے کے لئے ایمان کے جتنے اجزاء ہیں ان سب کا ان کو اقرار تھا۔ کلمہ شہادت وہ پڑھتے تھے، نماز وہ پڑھتے تھے، زکوٰۃ وہ ادا کرتے تھے، روزے وہ رکھتے تھے، حج وہ کرتے تھے اور غزوات میں بھی شرکت کرتے تھے۔ لیکن قرآن نے ان کے ظاہری اعتقادات اور اعمال کو تسلیم نہیں کیا، بلکہ اُن کو ایمان سے محروم، رسالت کا منکر، شیطان کا ساتھی اور کاذب قرار دیا اور جہنّم کے سب سے نچلے طبقے کا مستحق اور شرک کا مجرم ٹھیرایا۔ آخر کیوں؟

منافقین کے بہت سے جرائم میں دراصل اُن کا سب سے بڑا جرم تحاکم اِلَی الطّاغوت تھا۔ مسلم اور مومن ہونے کا سب سے بڑا تقاضا اللہ اور اُس کے رسول کی بے چون وچرا اور کامل اطاعت ہے اور یہ اطاعت کمال محبّت و شوق کے جذبے کے ساتھ مطلوب ہے ــــ محبّت اور شوق کے بارے میں مجھے آگے تفصیل سے گفتگو کرنی ہے۔ اطاعت ہو لیکن مار کے باندھے کی ہو، یا دل پسند معاملات میں اطاعت ہو اور ناپسند اُمور میں اطاعت نہ ہو، اور

جو کچھ اطاعت ہو وہ بھی "یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا" کی مطلوب کیفیت سے خالی ہو۔ اور اپنے معاملات تنازعات کے فیصلوں کے لئے اللہ کی کتاب اور اُس کے رسول کی سنّت کی طرف رُجوع کرنے کے بجائے اُن سے اعراض ہو بلکہ غیر الٰہی فیصلے مطلوب ہوں، رسم و رواج کی پابندی ہو، قرآن مجید اور رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بے لاگ عدالت کے بجائے دوسری عدالتوں سے انصاف طلبی ہو۔ (بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ حقیقی انصاف کے بجائے ناانصافی مطلوب ہو) تو یہ تحاکم اِلَی الطّاغوت ہے، جو شرک ہے اور شرک ناقابلِ عفو گناہ ہے جیسا کہ میں بالکل آغاز میں بھی عرض کر چکا۔ اب پھر اعادہ کرتا ہوں۔ سورۃ النّساء میں معمولی لفظی تغیّر کے ساتھ دو جگہ فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ ۚ وَمَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِیْمًا ۝ (آیت ۴۸)	بلاشبہ اللہ اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کے ساتھ شریک ٹھیرایا جائے اور اس گناہ کے سوا دوسرا گناہ جس کو چاہے معاف کر دے گا۔ اور جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا اس نے بڑا بہتان باندھا اور بڑا گناہ کیا۔

اس آیت کے سیاق و سباق میں یہود کے اس رویّے پر تنقید کی گئی ہے، جو انہوں نے احکامِ الٰہی اور شریعتِ الٰہی کے ساتھ مخالفانہ اور استہزاء کا اختیار کیا ہوا تھا اور غیر الٰہی طور طریقوں کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا ہوا تھا، جس کو اسی سورت کی آیت ۵۱ میں یوں بیان فرمایا: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ

اسی سورۃ النّساء میں آگے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ ۚ وَمَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا	بے شک اللہ اُس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کے ساتھ شریک ٹھیرایا جائے اس کے سوا اور (گناہ) جس کو چاہے بخش دے گا اور جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا وہ یقیناً گمراہی کے راستے میں بہت دور نکل گیا۔

اس آیت سے ماقبل جو آیت ہے وہ اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ جس ناقابلِ معافی شرک کا ذکر کیا گیا ہے، وہ منافقین کا شرک ہے جو اللہ اور اس کے رسول کے ان فیصلوں کو

جو اجتماعی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی معاملات سے متعلق ہوتے تھے، تسلیم کرنے میں پس و پیش بلکہ اعراض کرتے تھے، فرمایا:

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا (آیت ۱۱۵)

جو کوئی بھی رسولؐ کی مخالفت کرے جب کہ اس کے واسطے سیدھا راستہ کھول کر بیان کر دیا گیا اور جو کوئی بھی (حقیقی) مومنین کے راستے کے سوا اور راستے پر چلے تو جدھر وہ چلتا ہے ہم اُسے اُدھر ہی چلنے دیں گے اور اسے (آخرت میں) جہنّم میں داخل کریں گے اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے!

اس الهُدٰی اور سبیل المُؤمنین کو مختلف سورتوں میں متعدّد اسالیب سے اور خاص طور پر اسی سورۃ النّساء کی آیت ۵۹ میں واضح کیا جا چکا تھا جن کا حوالہ میں پہلے دو مرتبہ دے چکا۔ پھر اسی سورۂ مبارکہ کی آیت ۱۰۵ میں بھی بایں الفاظ بیان کیا جا چکا تھا کہ: اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۭ [بے شک (اے نبی!) ہم نے آپ پر حق کے ساتھ کتاب نازل کی ہے تاکہ آپ اللہ کی ہدایت کے مطابق لوگوں کے مقدّمات فیصل کریں!] ۔ منافقین دوسرے جرائم کے ساتھ اس تحاکم اِلَی الطّاغوت کے بھی مجرم تھے جو از رُوئے قرآن مجید کُفر، ظلم (شرک) اور فسق ہے۔ قرآن مجید سے دلیل سُن لیجئے:

شریعتِ الٰہی کا مقام | حاکمیّتِ الٰہی کے ضمن میں سورۃ المائدہ میں قطعیّت کے ساتھ فیصلہ سُنا دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت کے مطابق جس میں کتابُ اللہ، اور سُنّتِ رسول اللہ دونوں شامل ہیں۔ جو لوگ اپنے معاملات چاہے وہ انفرادی زندگی سے متعلق ہوں چاہے اجتماعی زندگی سے طے نہ کریں، وہی حقیقت کے اعتبار اور نفس الامری کے لحاظ سے کافر ہیں، ظالم ہیں، فاسق ہیں۔ فرمایا:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ ... . هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ ...... هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (۴۴، ۴۵، ۴۷)

اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون (شریعت) کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں .... وہی ظالم (مشرک) ہیں .... وہی فاسق (حد سے تجاوز کرنے والے) ہیں!

اِن آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے متعلق جو اللہ کی نازل کردہ شریعت یعنی کتابُ اللہ اور سُنّتِ رسول اللہ کے مطابق اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام معاملات طے نہ کریں۔ اس کے دائرے سے باہر قدم رکھیں۔ اللہ اور رسول کی ٹھہرائی ہوئی چیزوں کو حرام اور حرام ٹھہرائی ہوئی چیزوں کو حلال قرار دے لیں۔ اللہ کے نازل کردہ قوانین، حدود، تعزیرات کے مخالف اور مقابلے میں بنائے ہوئے قوانین، حدود، تعزیرات —— —— اور ضوابط پر عمل پیرا ہوں اور ان کی پابندی کریں، یا اُن کے دلدادہ ہوں ان کو پسند کریں۔ چاہے وہ کسی فردِ واحد (بادشاہ، ملک، آمر) کے وضع کردہ اور نافذ کردہ ہوں۔ چاہے کسی مختار جمہوری ادارے (پارلیمنٹ، کانگرس) کے، چاہے وہ کسی نام نہاد انقلابی کے نظریات ہوں، تو ایسے لوگ تین جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ جس میں پہلا جرم کفر ہے یعنی اس طرزِ عمل سے اللہ تعالیٰ کی حاکمیّت کا انکار لازم آتا ہے۔ دوسرا جُرم ظلم ہے اور سورۂ لقمان کی آیت ۱۳ اور نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ارشاد کی رُو سے شرک کی ایک تعبیر ظلم بھی ہے۔ لہٰذا یہ رویّہ شرک ہوا یعنی ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے والوں نے اللہ واحد کے حقِّ حاکمیّت میں اس فرد یا ادارے کو شریک ٹھہرا لیا، جن کے وضع کردہ اور نافذ کردہ قوانین کے مطابق فیصلے قبول کئے جائیں یا بطور نظریہ (ازم) اس کو پسند کیا جائے۔ تیسرا جرم فسق ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ غیر اللہ کے بنائے ہوئے قوانین کی برتری کو تسلیم کرنے کی وجہ سے ایسے شخص نے بندہ اور عبد ہونے کی حد اور حیثیت سے تجاوز بلکہ انحراف کیا، اسی طرزِ عمل کو فسق کہتے ہیں۔

خلاصہ کلام | میں نے تصوّرِ حاکمیّت کے متعلق قدرے تفصیل سے گفتگو اس لئے کی ہے کہ اس دَور میں جمہوریّت (POPULER SOVEREIGNTY) کا بہت چرچا ہے۔ جسے دیکھو وہ اس نیلم پری کا دیوانہ ہے۔ حالانکہ جس طرح شریعتِ الٰہی سے آزاد ملوکیّت شرک ہے، اُسی طرح شریعت سے آزاد جمہوریّت بھی شرک ہے۔ اس معاملے میں جو صحیح اسلامی طرزِ فکر ہے میں چاہتا ہوں کہ اس کو بھی واضح کردوں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حاکمیّتِ مطلقہ کے بارے میں اصولی اور واضح ہدایات و تعلیمات بیان فرمادی ہیں۔ اور بنی نوعِ انسان پر فرض اور لازم کیا ہے کہ انفرادی و اجتماعی معاملات ہدایتِ الٰہی کے مطابق انجام دیئے جائیں۔ البتہ اُس نے طرزِ حکومت کے باب میں لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا ہے کہ وہ تمدّن کی ترقی کے ساتھ ساتھ اپنے لئے طرزِ حکومت

منتخب کر سکتے ہیں۔ یعنی وہ طے کر سکتے ہیں کہ شریعتِ الٰہی کے نفاذ (EXCERSISE) کے لئے کیا طریقے اختیار کریں۔ اس کے لئے پابندِ شریعت ملوکیت بھی ہو سکتی ہے اور جمہوریت بھی۔ آج کل جمہوریت زدہ حضرات نے ملوکیت کو گالی بنا رکھا ہے اور اس کے خلاف کتابوں کے انبار لگا رکھے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ایسے حضرات موجودہ دور کے ملوک سے مالی تعاون و اعانت حاصل کرنے کے لئے عملاً اُن کی ثناء و مدح اور قصیدہ خوانی میں رطبُ اللّسان رہتے ہیں۔

نقطۂ عدل اس باب میں صحیح اور مبنی بر انصاف و عدل نقطۂ نظر یہ ہے کہ فی نفسہٖ نہ ملوکیت قابلِ ملامت ہے اور نہ جمہوریت۔ اُن کو جو طرزِ فکر اور نقطۂ نظر موجب ملامت بلکہ شرک بناتا ہے، وہ شریعتِ الٰہی سے بے نیازی اور آزادی ہے۔ جس کے لئے موجودہ دور کی مشہور و معروف اصطلاح لادینیت (SECULARISM) ہے۔

اگر بادشاہ ہوں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السّلام، یا بادشاہ ہوں وہ متقی اور نیکوکار لوگ جن کے تذکرے ہماری چودہ سو سالہ تاریخ میں محفوظ ہیں، جو خود کو اللہ ہی کا بندہ سمجھتے تھے اور شریعتِ الٰہی کو ہی نافذ کرتے تھے اور قرآنِ حکیم کے اس حکم کی پابندی بھی کرتے تھے کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران) اور جن کا معمول یہ تھا کہ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (الشوریٰ) ــ تو ایسے بادشاہوں کی بادشاہت کی تنقیص نہیں کی جا سکتی۔ دراصل ایسی بادشاہت ایک انتظامی امر (ADMINISLRATIVE MATTER) سے متعلق ہوتی ہے۔ جب بادشاہ بھی خدا کا عبد ہو اور نظام بھی شریعتِ الٰہی کے مطابق نافذ ہو، تو جو چیز مطلوب و مقصود ہے وہ حاصل ہو گئی۔ یہ نہ شرک ہے اور قابلِ ملامت و تنقیص ــ چونکہ اس طرح حاکمیتِ مطلقہ (ABSOLUTE SOVEREIGHTY) بادشاہ کی نہیں ہے بلکہ انتظامی لحاظ سے ایسا شخص ملِک یا بادشاہ ہوتا ہے۔

اسی طرح اگر کسی ریاست کے عوام یہ فیصلہ کر لیں کہ حاکمیتِ مطلقہ اللہ کو حاصل ہے۔ قانون اس کا چلے گا اور شریعت اُسی کی نافذ ہو گی۔ حسبِ ضرورت ہر نوع کی قانون سازی کتاب و سُنّت کے احکام کے اندر اندر ہو گی۔ نظائر کے لئے خلافتِ راشدہ کا تعامل، آثارِ صحابہ اور اُن سے ماخوذ اجتہاد و استنباط ہی ملک کے تمام نظام میں جاری و ساری ہوں گے۔ حدود و تعزیرات ان کے مطابق ہوں گی، عدالتیں ان ہی کے مطابق

مقدمات فیصل کریں گی۔ معاشی و اقتصادی شعبے اسی نظامِ شریعت کے مطابق چلیں گے ہماری تجارت، صنعت و حرفت، ہمارے بین الاقوامی تعلقات، ہماری صلح اور جنگ ان ہی ضابطوں کے تحت انجام پائے گی۔ ہمارے معاشرتی آداب و رسوم، ہماری ثقافت ہمارا ادب، ہمارا تمدن، ہماری تہذیب اسی نظامِ شریعت کی آئینہ دار ہوگی۔ ہماری فوج، ہماری پولیس، ہماری حکومت کے تمام حکام (اُولی الامر) اور اہل کار اسی ضابطۂ شریعت کے پابند ہوں گے۔ اگر ان حدود و قیود کے ساتھ ہمارے عوام اپنی رائے سے اپنے نمائندگان منتخب کریں اور یہ منتخب نمائندے ملک کا نظام شریعت کے مطابق چلانے کے لئے حکومت تشکیل دیں۔ پھر یہ صاحبِ اقتدار خدا کے بندے بن کر اس کی شریعت کے نفاذ کے لئے انتظامی اُمور کے نگران کی حیثیت سے اولوالامر کے فرائض انجام دیں تو یہ شرک نہیں ہوگا۔ یہ بھی ایک انتظامی ڈھانچہ ہوگا جو نفاذِ شریعت کیلئے وجود میں لایا جائے گا، اور یہ جمہوریت شرک نہیں ہوگی — اگر آپ چاہیں تو ایسی جمہوریت کو "اسلامی جمہوریہ" کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ "اسلامی جمہوریہ" کی اصطلاح کے قائل ہوئے تو آپ کو "اسلامی ملوکیت" کی اصطلاح کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا، اس کو گالی نہ بنائیے۔ "اسلامی ملوکیت" ہو سکتی ہے جیسے "اسلامی جمہوریہ" ہو سکتی ہے — یا جُناں کُن یا چُنیں۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السّلام کی ملوکیت اسلامی ملوکیت تھی۔ خود برِّصغیر پاک و ہند میں ایسے فرمانروا گزرے ہیں، جو اگرچہ ملک اور بادشاہ کہلائے لیکن اُن کی ملوکیت و بادشاہت کو بلا خوفِ لومۃ لائم اسلامی ملوکیت کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح دورِ اُمیّہ، دورِ عباسیہ اور دورِ عثمانیہ میں ایسے فرمانروا بھی گزرے ہیں جن کو اگرچہ خلیفہ کہا جاتا ہے لیکن وہ جس طور پر برسرِ اقتدار آتے تھے۔ اور جس طرح حکومت کرتے تھے اُس میں ملوکیت و بادشاہت کا عنصر انتہائی غالب تھا۔ بایں ہمہ وہ خود بھی متقی اور نیکوکار تھے اور اُن کے دورِ اقتدار میں اسلامی شریعت ہی رائج اور نافذ تھی۔ تو ان کی ملوکیت و بادشاہت کو بھی "اسلامی" کہا جائے گا۔ خدا کے لئے اپنی تاریخ سے قطعِ تعلق نہ کیجئے اور یہ نہ سمجھئے کہ خلافتِ راشدہ کے بعد چودہ صدیوں میں اس طرح کی ملوکیت ہی جاری رہی ہے۔ جس کو DIVINE KINGDOM کہا جائے، اور جس کو ضلالت سمجھا جائے۔ یہ طرزِ فکر تو تاریخ کے ساتھ، اپنے ماضی کے

ساتھ، اپنے اسلاف کے ساتھ اور اپنے ان تمام ائمہ، فقہا، اور محدثین کے ساتھ نا انصافی ہوگی، جو اس دور میں حکومتِ وقت کے اہم عہدوں پر بھی فائز رہے ہیں اور جنہوں نے ان حکومتوں کو اسلامی حکومت کے طور پر عملاً قبول اور منظور بھی کیا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ رفتہ رفتہ زوال آیا ہے، انحطاط کا عمل مسلسل ہوا ہے۔ ہم گرے اور انتہائی پستی میں گرے۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں جن پر گفتگو کا محل نہیں، اس کا سبب صرف ملوکیّت کو ٹھہرانا بڑی نا انصافی ہے۔

ذرا غور کیجئے کہ جس جمہوریّت کے آپ شیدائی ہیں اس کا عملی مظاہرہ تاریخ کے کس دور میں ہوا ہے، آپ اس کی کوئی نظیر پیش نہیں کر سکتے۔ خلافتِ راشدہ کو جو لوگ "جمہوریّت" کہتے ہیں۔ وہ یا تو جمہوریّت کے معانی اور مقتضیات سے ناواقف اور لاعلم ہیں یا وہ خلافتِ راشدہ کے تعامل کو سمجھ ہی نہیں پائے۔ یا خود کو فریب دینے کے ساتھ ساتھ خلقِ خدا کو بھی فریب دے رہے ہیں۔

ذرا اپنے ملک کا ہی جائزہ لیجئے جو اسلامی نظام کے اجرا اور نفاذ کے لئے قائم ہوا تھا۔ تیس سال ہونے کو آئے اور اسلامی شریعت کے نفاذ کا معاملہ ہنوز روزِ اوّل میں ہے اور "ہنوز دِلّی دُور است" کا مصداق بنا ہوا ہے۔ اب تک جو کچھ ہوا ہے وہ اس سے زائد نہیں کہ ہمارے دستور میں رہنما اصول (DIRECTIVE PRINCIPALS) میں یہ بات درج ہے کہ حاکمیّت (SOVEREIGNTY) اللہ کی ہے اور یہ بھی درج ہے کہ کوئی قانون سازی قرآن و سُنّت کے خلاف نہیں کی جائے گی۔ (NO LAGISLATION WILL BE DONE ——— REPEGNANT TO QURAN AND SUNNAH) لیکن ابھی تک یہ دونوں باتیں نافذ العمل دفعات (OPERATIVE CLAUSES) کی حیثیّت سے ہمارے دستور کا حصّہ نہیں۔ یعنی ہم اس بنیاد پر کہ فلاں قانون یا فلاں تعزیر قرآن و سنّت کے خلاف ہے۔ کسی عدالت سے رجوع نہیں کر سکتے اور نہ اس بات کے لئے استغاثہ دائر کر سکتے ہیں کہ حدود اللہ اور تعزیراتِ اسلامی جاری ہوں۔ نہ ہی عدالتیں اس بنیاد پر فیصلوں کی مجاز ہیں۔ چنانچہ عملاً جو کچھ ہو رہا ہے وہ آپ کے سامنے ہے کہ کہنے کو ہمارا ملک اسلامی جمہوریہ ہے۔ کہنے کو ہمارے ہاں جمہوری نظام قائم ہے

لیکن آپ کو ڈھونڈے سے بھی حکومت کے کاروبار میں، عدالتوں کے فیصلوں میں قرآن وسنّت پر عمل تو درکنار اس کا حوالہ (REGERENCE) تک نہیں ملے گا، حدود و تعزیراتِ اسلامی کا نفاذ تو دُور کی بات ہے۔ البتہ یہ بات پیشِ نظر رکھیے کہ گو نظامِ اسلامی تا حال رائج نہیں، حکومت بھی اسلامی نہیں، حالات خراب سے خراب تر ہیں، لیکن اللہ کی حاکمیت کا اُصول اور قرآن وسُنّت کے خلاف قانون سازی پر پابندی کا عزم چاہے وہ راہنما اصول کے طور پر ہی اختیار کیا گیا ہو، پاکستان کو ریاست (STATE) کی حد تک اسلامی قرار دینے کے لئے بڑی حد تک کفایت کرتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی غیر مسلم کلمۂ طیبہ ادا کر کے مسلمان ہو گیا ہو، لیکن ابھی اُس نے اسلام کے تقاضوں پر عمل شروع نہ کیا ہو یا یہ کہ ایک شخص نے اپنی جائز ملکیت کی زمین کا ایک قطعہ مسجد کی تعمیر کے لئے وقف کیا ہو لیکن اس پر ابھی مسجد کی تعمیر کا آغاز نہ ہوا ہو اور اس قطعۂ زمین پر فی الحال کوڑے کرکٹ کا ڈھیر ہو۔ یہ طرزِ عمل فسق و فجور ہے، جس سے نکلنے کی ہمیں فکر کرنی چاہیے۔

جب تک ہمارے ملک کے عوام وخواص میں نظامِ اسلامی کی پابندی کا صحیح داعیہ پیدا نہیں ہوتا اور جب تک عملی طور پر ہماری انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی تک تمام شعبے اللہ اور اُس کے رسولؐ کی تعلیمات کے تابع نہیں ہو جاتے یعنی شریعتِ الٰہی اپنے تمام مقتضیات، مطالبات، متضمنات کے ساتھ نافذ نہیں ہو جاتی۔ نہ ہماری حکومت اسلامی حکومت ہے اور نہ ہماری ریاست حقیقی معنوں میں "اسلامی ریاست" اور اسلامی جمہوریہ کہلانے کی مستحق ہے۔ فی الحال جو صورتِ حال ہے اس کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ: "دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے!"

حقیقی طور پر نظامِ اسلامی کے نفاذ اور اس کے استحکام کا از رُوئے قرآن مجید اور سُنّتِ رسولؐ صحیح اور اساسی منہجِ عمل کیا ہے؟ وہ اس وقت کی گفتگو کا موضوع نہیں، یہ علیحدہ بحث ہے جس پر تفصیلی گفتگو منتخب نصاب کے دروس میں سورۂ جمعہ کے مطالعے کے موقع پر ہوتی ہے۔ نیز اس موضوع پر میری چند تقاریر مطبوعہ شکل میں بھی موجود ہیں۔

[حض]رت مولانا محمد اسحاق صدیقی ندوی کراچی

اہلِ سُنّت اور نظریۂ امامت

الحمد للہ ربّ العٰلمین والصّلوٰۃ والسلام علیٰ سیّد المرسلین محمّدٍ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین ، امّا بعد :

تاثیرِ صحبت ایک بدیہی حقیقت ہے اور جب مختلف مذاہب کی پیروی کرنے والی جماعتوں کے درمیان میل جول ہوتا ہے تو اسی اُصُول کے تحت ایک جماعت دوسری جماعت کی طرف اپنے افکار و عادات منتقل کرتی ہے اور اس کے خیالات و اعمال پر اثر انداز ہوتی ہے تاثیر و تاثّر کا یہ عمل غیر شعوری طور پہ دونوں طرف سے ہوتا ہے۔ مگر جس جماعت کی قوّتِ مقابلہ قوی تر ہوتی ہے وہ دوسروں سے متاثّر نہیں ہوتی۔ پھر اگر اس کی قوّتِ تاثیر بھی نسبتًا زیادہ قوی ہو تو وہ دوسری جماعت کو متاثّر بھی کرتی ہے۔ ورنہ صرف اپنے سرمائے کو محفوظ رکھتی ہے۔ قوّتِ مقابلہ اور قوّتِ تاثیر کی کمی و بیشی کے قوانین و اُصُول کیا ہیں ؟ اس سے یہاں بحث نہیں کرنا چاہتا۔ کیونکہ یہ چیز مجھے اصل موضوع سے بہت دُور کر دے گی۔ یہاں تو اس قانونِ تاثیر و تاثّر کے تذکرے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اشاعت و حفاظت دینِ مبین کے عظیم فرض کو انجام دینے کے لئے اسے بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ نیز یہ دکھانا ہے کہ اہلِ سُنّت والجماعت کی دینی زندگی پر اس اُصُول کا کیا اثر پڑا۔ ہم اس زاویے سے نظر کریں تو یہ واقعہ نظر آئے گا کہ ہمارے سُنّی بھائیوں میں بہت سے ایسے عقائد و افکار اور اعمال و عادات پائے جاتے ہیں جو صرف غیروں سے آئے ہیں اور مسلکِ اہلِ سُنّت کے بالکل خلاف ہیں۔ کثیر تعداد کی وجہ سے اہلِ سُنّت ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور صدیوں سے مختلف اقوام اور مذہبی گروہوں سے روابط رکھتے ہیں۔ جہاں ان میں قوّتِ مقابلہ اور قوّتِ تاثیر قوی رہی، وہاں انہوں نے دوسروں کو متاثّر کیا اور خود اغیار کے اثر سے محفوظ رہے۔ مگر جہاں مختلف اسباب کی بنا پر اُن کی یہ دونوں قوّتیں کمزور ہو گئیں، وہاں یہ خود متاثّر ہو گئے اور غیروں کے افکار و اعمال اُن میں پھیل گئے۔ اِن

اسباب کا تذکرہ علیحدہ اور مستقل بحث ہے جسے یہاں چھیڑنا غیر ضروری اور باعثِ طوالت ہے
پاکستان اور بھارت میں اکثر مقامات پر تین چار صدیوں سے یہی صورت موجود ہے۔ یعنی عوام
اہلِ سُنّت کی قوّت مقابلہ اور قوّتِ تاثیر کمزور ہے۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ وہ دوسرے مذاہب کے پیروؤں
سے متاثر ہو گئے۔ برِّصغیر میں اُن کا رابطہ ہندوؤں اور شیعوں کے ساتھ زیادہ رہا اور عوام کی
بڑی تعداد ان دونوں کے خیالات و عادات سے متاثر ہوئی۔ اِن دونوں میں نسبتاً شیعی افکار
نے زیادہ جگہ حاصل کی۔ اِن خلافِ مسلک اہلِ سُنّت افکار میں جن کی درآمد شیعوں کی طرف
سے ہوئی "امامت" کا تصوّر بہت اہم ہے۔ یہ خالص شیعی عقیدہ اور مذہب ہے مگر اس
وقت بہت سے سُنّیوں میں بھی پایا جاتا ہے اگرچہ اہلِ سُنّت نے اِسے کامل شیعی شکل میں تو نہیں
قبول کیا، مگر جس شکل میں اُن میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے وہ بھی قرآن و حدیث کے خلاف اور
مسلکِ اہلِ سُنّت سے بہت دُور ہے۔

اِس مضمون کا مقصد اپنے سُنّی بھائیوں کے عقائد کی اصلاح ہے، شیعوں کے عقائد سے
ہمیں کوئی تعلق نہیں۔ لیکن یہ بتانے کے لئے کہ اہلِ سُنّت پر شیعی عقیدۂ امامت کا کیا اثر ہوا؟
لازم ہے کہ شیعوں کا عقیدہ بھی بیان کیا جائے۔

شیعی عقیدۂ امامت شیعوں کا عقیدہ یہ ہے کہ نبی کی طرح امام کا تقرر بھی اللہ تعالیٰ
کی طرف سے ہوتا ہے۔ اُس پر بھی وحی نازل ہوتی ہے۔ نبی اور رسولوں کی طرح وہ بھی معصوم
ہوتا ہے۔ اسے تحلیل و تحریم کا بھی اختیار ہوتا ہے۔ یعنی وہ جس چیز کو چاہے حرام کر دے اور جس شے
کو چاہے حلال کر دے۔ اُس کی اطاعت سب پر فرض ہوتی ہے۔ جو شخص امام کی امامت پر ایمان
نہ لائے وہ کافر خارج از اسلام ہے۔ یہ لوگ امام کے لئے کچھ اور اوصاف و خصوصیات بھی ثابت
کرتے ہیں، جنھیں ہم بخوفِ طوالت نظرانداز کرتے ہیں۔ شیعوں کے نزدیک نبی اکرم صلی اللہ علیہ
وسلم کے بعد بارہؔ امام ہوئے۔ جن میں سے گیارہ گذر چکے ہیں اور بارھویں چھپے ہوئے ہیں قیامت
کے قریب ظاہر ہوں گے۔ اُن کا لقب "امام مہدی" ہے۔ شیعہ جن لوگوں کو اپنا امام کہتے ہیں،
اُن کے نام درج ذیل ہیں :-

حضرت علیؓ، حضرت حسینؓ، حضرت حسن رضی اللہ عنہم، یہ تینوں حضرات صحابی ہیں۔ ان کے
بعد حضرات علی بن حسین (المعروف بزین العابدین) باقر، جعفر صادق، موسیٰ رضا، نقی، تقی،
حسن عسکری، مہدی رحمہم اللہ و قدس اسرارہم۔ یہ اثنا عشری شیعوں کا مذہب ہے، جن کی تعداد

پاکستان میں شیعوں کے دوسرے فرقوں سے زائد ہے۔ اِن میں سے بعض حضرات کے بارے میں شیعوں کے دوسرے فرقوں مثلاً اسمٰعیلیوں کو اختلاف ہے۔ مگر عقیدۂ امامت اُن کے سب فرقوں میں مشترک ہے اور شیعہ مذہب کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اپنے اِن بارہ امامؑ کو شیعہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا سب انبیاء و مرسلین سے افضل اور آنحضورؐ کے برابر سمجھتے ہیں۔

مذہب اہلِ سُنّت عرض کر چکا ہوں کہ اس مضمون میں شیعہ ہمارے مخاطب نہیں ہیں اس لئے شیعی نظریۂ امامت کے ضروری تعارف کے بعد دلائل کی روشنی میں اُس کی غلطیوں کو واضح کرنا بھی ہمارے پیشِ نظر نہیں، مگر اس نظریے کے مقابلے میں مذہبِ اہلِ سُنّت کا بیان واجب اللازم ہے جو درج ذیل ہے :-

اہلِ سُنّت کے نزدیک نظریۂ امامت از سرتا پا باطل اور ضلالِ مُبین ہے۔ مذہبِ اہلِ سُنّت یہ ہے کہ انسانوں میں انبیاء علیہم السّلام کے سوا کسی کی بعثت براہِ راست و بلاواسطہ مخاطب اللہ نہیں ہوتی۔ یعنی انبیاء کے سوا کسی کو براہِ راست حکم یا پیام بھیج کر اللہ تعالیٰ کسی منصب پر مقرر نہیں فرماتے اور انبیاء کے سوا انسانوں میں کسی پر وحی نازل نہیں ہوتی نہ کسی پر اللہ تعالیٰ کی کتاب اُترتی ہے۔ علیٰ ہذا، اِن کے سوا کوئی معصوم بھی نہیں ہوتا۔ تحلیل تحریم کا اختیار بھی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں۔ انبیاء علیہم السّلام بحکمِ الٰہی تحلیل و تحریم کرتے ہیں لیکن درحقیقت وہ بھی تعلیم و تبلیغ امرِ الٰہی اور اُس کا بیان ہوتا ہے۔ انبیاء کے سوا دوسرے لوگ، انبیاء کے بیان کردہ احکامِ حلت و حرمت کی تشریح کرکے حوادث و واقعات پر انہیں منطبق کرتے ہیں۔

غیر نبی کا رُتبہ خواہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو کسی نبی کے برابر نہیں ہو سکتا۔ ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کے نبی کا مرتبہ، بڑے سے بڑے ولی اللہ سے ہزاروں درجہ بلند و برتر ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم تو افضل العالمین ہیں، آپؐ کے برابر کوئی بھی نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح انبیاء کے سوا کسی کی اطاعتِ مطلقہ فرض نہیں۔ اُن کے سوا کسی اور کی اطاعت اگر فرض ہوتی ہے تو انہیں کے حکم کے واسطے سے اور محدود ہوتی ہے۔ مثلاً والدین کی اطاعت فرض ہے مگر اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ اور ان کے رسول نے ان کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ حکمِ الٰہی اور تعلیمِ رسول کے خلاف والدین کی اطاعت جائز بھی نہیں چہ جائیکہ فرض یا واجب ہو۔ شیعہ امامت کے جو معنی بیان کرتے ہیں، ان معنی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک بھی امام نہیں ہوا، اور نہ قیامت تک ہو سکتا ہے اور بارہؑ امام ایک لفظِ بے معنیٰ ہے جس کے

مصداق کا کوئی وجود نہیں اور نہ ہو سکتا ہے۔ نیز یہ عقیدہ، عقیدۂ ختمِ نبوّت کے خلاف ہے۔ جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہے وہ درحقیقت آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کو خاتم النبیین نہیں سمجھتا۔

ناواقف اہلِ سُنّت پر نظریۂ امامت کا اثر

یہ تو مذہب اہلِ سنّت ہے، مگر شیعوں نے اپنے نظریۂ امامت کا اس قدر پروپیگنڈہ کیا کہ بہت سے سُنّیوں کے ذہن میں بھی اسے جگہ مل گئی۔ پوری کوشش کے باوجود یہ غلط نظریہ اُن میں مقبول نہ ہوتا۔ اگر قوّتِ مقابلہ کی کمی کی وجہ سے خود اُن کا ذہن اس بارے میں کمزور نہ ہوتا۔ دین سے جہالت و ناواقفیت، اہمیّتِ سُنّیت کا فقدان بعض حکمرانوں اور حکومتوں کی بے راہروی، رہنماؤں کی غفلت ایسی چیزیں ہیں جن کی وجہ سے دین کے بارے میں اُن کی قوّتِ مقابلہ کمزور پڑ گئی اور ان کے ذہن نے اس غلط عقیدے کو جگہ دے دی تاہم نورِ ایمان ان کے دل میں موجود تھا۔ اگرچہ اُس کی لَو دھیمی پڑ گئی تھی۔ مگر اتنی روشنی نے بھی ان کی کچھ نہ کچھ حفاظت کی اور انہوں نے اس نظریہ کو کامل طور پر نہیں قبول کیا۔ بلکہ ان کے ذہن نے اس میں کچھ تراش خراش کر لی۔ باوجود ترمیم و تنسیخ آج بھی جس صورت میں عقیدۂ امامت بعض اہلِ سُنّت میں موجود ہے، وہ سراسر غلط اور باطل ہے۔ اس موضوع کے متعلق غلط خیالات و عقائد بعض اہلِ سنّت میں پائے جاتے ہیں۔ ان کا تذکرہ اور ان پر تبصرہ سطور میں کروں گا، اور یہی تذکرہ و تبصرہ درحقیقت اس مضمون کی جان ہے۔

غلط افکار اس قسم کے سُنّی دین سے ناواقفیت اور دوسروں سے متاثر ہونے کی وجہ سے یہ خیال کرتے ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ شانہٗ نے صدّیقیّت یا شہادت کو ایک خاص درجہ قرار دیا ہے۔ اسی طرح "امامت" بھی کوئی درجۂ ولایت ہے جو منجانب اللہ ملتا ہے اور جسے مقرر فرما کر اللہ تعالیٰ نے اس پر صرف مندرجہ بالا حضرات کو فائز فرمایا اور یہ منصب ان حضرات کے سوا کسی کو نہیں عطا فرمایا گیا۔ ان بارہ حضرات کو یہ لوگ ائمہ معصومین اور بارہ معصوم بھی کہتے ہیں۔ یعنی انہیں انبیاء کی طرح معصوم سمجھتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ یہ سب خیالات غلط اور باطل ہیں۔ مذہب اہلِ سُنّت میں اُن کی کوئی گنجائش نہیں۔ قرآن و حدیث میں اس معنیٰ میں امامت کا تذکرہ تک نہیں اور درجاتِ ولایت میں "امامت" کے نام کسی درجہ کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ جس شخص کو اس کا دعویٰ ہو وہ قرآن و حدیث سے

ثابت کرے۔

امام کے معنی مقتدا اور پیشوا کے ہیں۔ اسی لئے جس شخص کی اقتدا نماز میں کی جاتی ہے اُسے امام کہتے ہیں۔ وہ نماز میں ہمارا مقتدا ہوتا ہے اور ہم اُس کے مقتدی۔ ان معنی کے لحاظ سے مذکورہ بالا حضرات کو بھی امام کہنا صحیح ہے۔ کیونکہ حضرات مذکورہ باہمی فرقِ مراتب کے ساتھ ہمارے بزرگ اور مقتدا ہیں۔ لیکن یہ انہیں کی خصوصیت نہیں اور صرف ان بارہ حضرات کو امام کہنے کے کوئی معنی نہیں۔ جبکہ ہمارے اماموں یعنی مقتداؤں اور پیشواؤں کی تعداد بارہ ہزار سے بھی زائد ہے، بلکہ لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ اور آئندہ بھی بکثرت امام ہوتے رہیں گے۔ ہر صحابی ہمارے بلکہ پوری اُمّت کے امام ہیں۔ اور ان کی تعداد ایک لاکھ سے زائد تھی۔ ان کے بعد بھی بکثرت ائمہ ہوتے رہے۔ مثلاً امام ابوحنیفہ جو "امامِ اعظم" کے لقب سے مشہور ہیں اور ہم احناف جن کی تقلید و اقتدا کرتے ہیں۔ امام مالک، امام شافعی، امام احمد حنبل رحمہم اللہ! یہ چار امام تو اس قدر مشہور ہیں کہ اہلِ سُنّت کا بچّہ بچّہ انہیں جانتا ہے اور ان کی امامت کا قائل ہے۔ اُن کے علاوہ بھی بکثرت امام ہو چکے ہیں۔ مثلاً امام بخاری، امام ترمذی، امام مسلم رحمہم اللہ ان کثیر التّعداد ائمہ کی موجودگی میں صرف ان بارہ حضرات کو امام کہنے کے کیا معنی؟ یہ بات بالکل صاف ہے کہ امام کا عقیدہ بالکل غلط اور امامت کو ان حضرات کے ساتھ مخصوص سمجھنا خیالِ باطل ہے۔

ان حضرات کو معصوم کہنا بھی گمراہی ہے۔ اس شدید بے راہ روی میں عوام کا ایک بڑا طبقہ مبتلا ہے۔ بلکہ علماء کی ایک تعداد اور خام صوفیوں کی اس سے بڑی تعداد بھی اس گمراہی میں عوام کی سطح پر نظر آتی ہے۔ اس خیال کی غلطی بالکل واضح ہے۔ مسلک اہلِ سُنّت یہ ہے کہ انسانوں میں انبیاء علیہم الصّلوٰۃ والسّلام کے سوا کوئی بھی معصوم نہیں۔ معصوم اُسے کہتے ہیں جس سے خطا اور گناہ کا صدور ممکن ہی نہ ہو۔ اور سوا انبیاء کے ایسا کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس اُمّت میں بکثرت ایسے افراد ہوئے جن سے ساری عمر کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا۔ لیکن معصوم انہیں بھی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ گناہ کا صدور اُن سے ممکن تھا، اگرچہ واقع نہ ہوا۔ انسانوں میں انبیاء کے سوا کسی کو معصوم کہنا شرک فی النّبوّۃ ہے[1]۔ کیونکہ عصمت خاصۂ نبوّت ہے۔ انبیاء کے جو خصوصیات ہیں ان میں غیر نبی کا شریک و سہیم نہیں ہو سکتا۔ ان بارہ حضرات کو یا ان میں سے بعض کو یا ان کے سوا کسی اور کو جو نبی نہ ہو۔ معصوم سمجھنا خیالِ باطل، معصیت اور گمراہی ہے جس سے توبہ کرنا چاہیئے۔

---

[1] یعنی انبیاء کے خاص کمالات و اوصاف میں کسی ایسے شخص کو شریک سمجھنا جو نبی نہ ہو۔ منہ

عرض کیا جا چکا کہ انسانوں میں انبیاء کے سوا کسی شخص کی بعثت براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوتی اور نبی کے سوا کسی کا تقرر کسی منصب پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے بلاواسطہ حکم بھیج کر نہیں کیا جاتا۔ یہ بات بہت اہم ہے اور اسے خوب سمجھ لینا چاہیئے۔ اس سے ناواقفیت کی وجہ سے اہلِ سُنّت کی ایک بڑی تعداد شیعی اثرات کی وجہ سے سمجھتی ہے کہ اُن کے بارہ اماموں کا تقرر منصبِ امامت پر براہِ راست اللہ کی طرف سے ہوا تھا اور انہیں امام سمجھنا ضروری ہے۔ یہ عقیدہ فاسد و باطل اور مسلک اہلِ سُنّت کے خلاف ہے۔ مندرجہ بالا اصُول اور قاعدہ ملحوظ رہے تو اس قسم کے خیالِ باطل میں مبتلا ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

سُنّۃُ اللہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہٗ اپنے بعض مقبول بندوں کو دوسروں کی ہدایت کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اس کی ایک شکل تو عام ہے اور ایک خاص۔ عام شکل یہ ہے کہ اپنے جس بندے سے جو کام لینا ہوتا ہے اُس کے دل میں اس کا ذوق و شوق پیدا فرما کر اسے اس کی توفیقِ خاص عطا فرماتے ہیں۔ انہیں بندوں میں سے بعض کا مرتبہ بلند کر کے ان سے تجدید دین کا کام لیتے ہیں۔ ایسے حضرات مجدّد کہلاتے ہیں۔ مگر یہ تقرّر اسی عام قانونِ توفیق کے تحت ہوتا ہے۔ اس کے لئے نہ کوئی فرشتہ نازل ہوتا ہے، نہ کوئی پیام اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے اور تجدیدِ دین کی یہ توفیق بھی نبی ہی کے طفیل میں اور اسی کی اتّباع کی وجہ سے ہوتی ہے۔ براہِ راست، بلاواسطۂ نبی یہ منصب کسی کو نہیں ملتا۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ مجدّد کو اپنے مجدّد ہونے کا علم ہو۔ بسا اوقات اسے عمر بھر اپنے مجدّد ہونے کا علم نہیں ہوتا۔ دوسرے صاحبانِ علم و دانش آثار و قرائن یا کشف[1] کی بنا پر اسے مجدّد سمجھنے لگتے ہیں۔ کسی کو مجدّد تسلیم کر لینا شرعاً کسی پر واجب بھی نہیں۔ اگر کسی مجدّد کو کوئی شخص مجدّد نہ تسلیم کرے تو اس کی وجہ سے نہ گنہگار ہوگا نہ اسے گمراہ کہا جا سکتا ہے۔ بعض مجدّدین کو اپنے مجدّد ہونے کا علم بھی ہو جاتا ہے مگر وہ بھی آثار و قرائن یا کشف کی بناء پر اور باوجود اس کے اگر وہ خود کو مجدّد نہ سمجھے یا اُس میں شک کرے اسے ذرّہ برابر بھی نقصان نہیں پہنچتا۔ شرعاً اُس پر واجب نہیں کہ خود کو مجدّد سمجھے یا کہے۔ اگر کسی مصلحت سے وہ اس کا اظہار کرے تو یہ بھی جائز ہے، مگر شرعاً واجب نہیں۔

شکلِ خاص یہ ہے کہ اس کی بعثت اللہ کی طرف سے ہوئی ہو اور اس کا اظہار اس طرح فرمایا

---

[1] یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ کشف کوئی شرعی دلیل نہیں۔ اس میں غلطی کا بھی امکان ہوتا ہے اس لئے اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ منہ

گیا ہو کہ اس بعثت کا یقین ہو جائے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ بعثت منجانب اللہ بلاواسطہ اور براہِ راست حکمِ الٰہی سے ہوئی ہو اور اس بعثت کا یقین کرنا خود مبعوث اور دوسروں پر فرض ہو۔ یہ درجۂ نبوّت ہے۔ ہر نبی کو اپنی نبوّت پر ایمان لانا اور اس کا یقین کرنا لازم ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسروں پر بھی فرض ہے کہ اس کی نبوّت پر ایمان لائیں۔ ہمارے نبی کریم خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد اس کا دروازہ بند ہو چکا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ بعثت منجانب اللہ بواسطہ نبی ہو۔ جیسے حضرت طالوتؑ کو "ملک" بنایا گیا تھا۔ یا جیسے ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کی بعثت جہاد وغیرہ مختلف کاموں کے لئے فرمائی اور مختلف مناصب و خدمات دینیہ پر اُن کا تقرر فرمایا۔ چونکہ انبیاء کے سب دینی کام حکمِ الٰہی سے ہوتے ہیں اس لئے اُن حضرات کا تقرر بھی منجانب اللہ بواسطہ نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سمجھا جائے گا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اس کا دروازہ بند ہو گیا اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی جانب سے بلاواسطہ نبی سوا نبی اور رسول کے کسی کی بعثت نہیں ہوتی اور نبوّت و رسالت کا دروازہ بند ہو چکا۔ جو شخص ائمہ اثنا عشر یا کسی اور کے متعلق یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے براہِ راست اسے مبعوث فرمایا وہ ختمِ نبوّت کا منکر اور سخت گمراہ ہے۔ خواہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانِ مبارک میں اس بعثت کا قائل ہو یا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اسی طرح یہ بات بھی روشن ہو گئی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے کسی کی بعثت ہونا بھی غیر ممکن ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو امام بمعنی مذکور نہیں بنایا۔ بلکہ امام کا لفظ بھی اس معنی میں کبھی نہیں استعمال فرمایا۔ یہ معنی تو بعض لوگوں نے اپنی طرف سے گھڑ لئے ہیں۔ قرآن و حدیث میں اُن کا کہیں نام و نشان بھی نہیں۔ اس طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی امام کی پیشین گوئی بھی نہیں فرمائی۔

ان واضح حقیقتوں پر نظر کرنے کے بعد ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ "امامت" کا خیال بالکل بے بنیاد اور باطل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے "امامت" کا کوئی منصب مقرر نہیں فرمایا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خیالی منصب کی طرف اشارہ تک نہ فرمایا۔ پھر اس خیال کی بنیاد کیا ہے؟ یہ صرف تقلیدِ آباء کا نتیجہ، اور مذہبِ اہلِ سُنّت کے بالکل خلاف ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابلِ توجہ اور اہم ہے کہ بزرگانِ دین سے عقیدت کے ساتھ فرقِ مراتب

ملحوظ رکھنا بھی لازم ہے۔ ان بارہ حضرات میں سے حضرتِ علیؓ، حضرتِ حسنؓ اور حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم تو صحابیت کے درجہ پر فائز ہیں۔ اُن کے رُتبۂ عالی کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اگرچہ ان تینوں حضرات میں بھی درجات و مراتب کے لحاظ سے باہم بہت فرق ہے مگر رُتبۂ صحابیت سب میں مشترک ہے اور اُن کے باہمی فرقِ مراتب کی بحث یہاں غیر ضروری اور غیر مقصود ہے بگر ان کے علاوہ اُن میں سے جو حضرات صحابی نہیں ہیں مثلاً حضرت زین العابدینؒ یا حضرت جعفر صادقؒ ان کے بارے میں بھی عوام اہلِ سُنّت کا ایک بڑا طبقہ بلکہ خواص کا ایک گروہ بھی غلو میں مبتلا ہے۔ یہ لوگ ان حضرات کو صحابہ کرامؓ سے بھی افضل یا کم از کم ان کے برابر سمجھتے ہیں۔ یہ غلط خیال بھی شیعوں کا اثر ہے۔ حق یہ ہے کہ رُتبۂ صحابیت بہت اُونچا ہے۔ ان حضرات کا رُتبہ بھی بلند ہے اور یہ بھی اپنے زمانہ کے اولیاءِ کاملین میں سے تھے، لیکن ان میں سے کوئی کسی ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کے برابر بھی نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے آنحضورؐ کے طفیل میں ایک لمحہ میں جو درجۂ ولایت حاصل ہوتا تھا۔ وہ ہزار برس کے ریاض و مجاہدات سے بھی نہیں حاصل ہو سکتا۔ جسے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت نصیب نہ ہوئی اسے صحابیت کے درجۂ عالی تک کسی طرح بھی رسائی نہیں ہو سکتی۔ ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کا رُتبہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس سے بدرجہا بلند و برتر ہے۔ رہی فضیلتِ نسب تو وہ ایک فضیلتِ جُزئی ہے جسے قربِ بارگاہِ الٰہی میں کوئی دخل نہیں۔ اصل فضیلت جسے فضیلتِ کُلّی بھی کہتے ہیں، حق تعالیٰ کی بارگاہ میں درجۂ قرب کی فضیلت ہے اور اس کا جو درجۂ عالی صحابۂ کرام کو حاصل تھا، وہ کسی دوسرے بڑے سے بڑے ولی کو بھی نہیں حاصل ہو سکتا۔ خواہ اُس کا نسب کتنا ہی اُونچا کیوں نہ ہو۔ ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کا مرتبہ ان حضرات کے مرتبہ سے سینکڑوں درجہ زیادہ بلند و برتر ہے۔

بعض حضرات یہ اشکال پیش کرتے ہیں کہ ہم بکثرت بزرگوں اور اکابرِ اُمّت کی تحریروں میں ان حضرات کے نام کے ساتھ "امام" اور "علیہ السّلام" کے الفاظ دیکھتے ہیں۔ حالانکہ ان اکابر کی کسی تحریر میں کسی دوسرے ولی اللہ صحابی یا غیر صحابی کے نام کے ساتھ یہ الفاظ نہیں ملتے۔ جن حضرات کی تحریروں یا تقریروں کا حوالہ دیا گیا ہے، اُن کی عظمت مسلّمہ بات ہے۔ اُن کی تحریروں میں بکثرت "امام حسین علیہ السّلام" اور "امام باقر علیہ السّلام" ملتا ہے۔ سیّدنا حضرت علیؓ کا تذکرہ "امامِ عالی مقام" یا "جناب امیر علیہ السّلام" کے عنوان سے کرتے ہیں۔ مگر "امام عمر علیہ السّلام" اُن کی کسی تحریر میں نہیں ملتا۔

یہ اشکال واقعی بہت سخت ہے اور جو شخص حقیقتِ حال سے واقف نہ ہو اس کے لئے غلط فہمی کا باعث ہو سکتا ہے۔ لیکن حقیقتِ حال معلوم ہونے کے بعد خود بخود دُور ہو جاتا ہے اور اور ہم نے جو بات اوپر عرض کی ہے وہ بالکل بے غبار ہو جاتی ہے۔

عام قاعدہ یہ ہے کہ جس چیز کا رواج عام ہو جاتا ہے اُس کی صحت و غلطی کی طرف توجہ نہیں رہتی اور ایسے افراد جو اس کی حقیقت اور اچھائی برائی کی طرف توجہ کریں، ہوتے ہی نہیں، اور اگر ہوتے بھی ہیں تو بہت کم۔ بہت سی خلافِ شریعت رسمیں مسلمانوں میں مروج ہیں۔ یہاں تک کہ بکثرت علماء و صلحاء کے گھروں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ مگر ان لوگوں کو ان کی برائی کی طرف توجہ بھی نہیں ہوتی۔ بلکہ بہت سے ایسے صاحبانِ علم ملیں گے جو انہیں بُرا سمجھنے کے باوجود ان پر عمل پیرا ہیں۔ الفاظ و محاورات کے استعمال میں یہ قاعدہ اور بھی نمایاں ہے جن الفاظ کا رواج عام ہو جاتا ہے انہیں خواص بھی عوام کی طرح استعمال کرنے لگتے ہیں۔ اور ان کی غلطی و صحت نیز عوام کے ذہن پر ان کے اثرات کی طرف توجہ نہیں ہوتی مثلاً القاب میں "قبلۂ کونین و کعبۂ دارین" کے الفاظ استعمال کرنا از رُوئے شریعتِ مقدسہ صحیح نہیں اور انہیں نہ استعمال کرنا چاہیئے۔ مگر اُن کا استعمال اب سے چند سال پیشتر بہت عام تھا یہاں تک کہ علماءِ دین بھی اپنے والد یا چچا وغیرہ بزرگوں کو جو خط لکھتے تھے ان میں یہی الفاظ بطورِ القاب لکھتے تھے حالانکہ کھلی ہوئی بات ہے کہ کسی انسان کو قبلہ یا کعبہ کہنا صحیح نہیں۔ اسی طرح علی بخش، حسین بخش، نبی بخش وغیرہ ایسے نام رکھنا، جس میں آدمی کے وجود کی نسبت اللہ کے سوا کسی دوسری طرف کی گئی ہو شرعاً ناجائز اور ممنوع ہے۔ کیونکہ ان اسماء سے بُوئے شرک آتی ہے۔ لیکن خاصی تعداد میں ایسے علماء گذرے ہیں جن کے یا جن کی اولاد کے نام اسی قسم کے تھے۔ بلکہ آج بھی ایسے علماء مل جائیں گے جن کے نام اسی طرح کے ہوں گے۔ ان علماء سے مسئلہ پوچھا جائے اور انہیں توجہ دلائی جائے تو یہ بھی اس قسم کے ناموں کو ممنوع کہیں گے لیکن استعمال عام کی وجہ سے ان اسماء کی غلطی کی طرف انہیں توجہ نہیں ہوتی۔ ان مثالوں سے زیرِ بحث مسئلہ صاف ہو جاتا ہے۔ دولتِ عباسیہ کی کمزوری کا اثر یہ ہوا کہ شیعوں نے ہر طرف زور پکڑا دیلمیوں کی سلطنت قائم ہو گئی۔ اور رفتہ رفتہ دنیا کے مختلف خطّوں میں شیعی سلطنتیں قائم ہو گئیں جو زور و زر دونوں سے کام لے کر اپنے باطل مذہب کی اشاعت کرتی رہیں۔ اہلِ سُنّت پر اُن کی اس تبلیغ کا یہ اثر ہوا کہ وہ بھی ان کی مندرجہ بالا حضرات کے لئے "امام" اور

"علیہ السّلام" کے القاب استعمال کرنے لگے۔ رواج عام ہوگیا تو سُنّی علماء بھی یہی القاب لکھنے اور بولنے لگے۔ رواج عام کی وجہ سے انہیں ادھر توجہ نہیں ہوئی کہ اس سے شیعوں کے عقیدۂ امامت کو رواج و قبول میں مدد ملے گی۔ غالباً اس وقت عوام اہلِ سُنّت کی دینی بیداری اور علماءِ دین سے اُن کے ربط و تعلّق کی وجہ سے ان کے عقیدے کے فساد اور عقیدۂ امامت ان میں مروّج ہونے کا اندیشہ بھی نہ ہوگا۔ اندیشہ نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شیعہ اپنے مذہب کا اخفا بھی کرتے تھے۔ جیسا کہ آج بھی تا بہ امکان اخفا سے کام لیتے ہیں اور اپنے مذہب کی اہم کتابوں کو اہلِ سُنّت سے مخفی اور اُن کی دسترس سے باہر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شیعوں کے اس طرزِ عمل کی وجہ سے اس دور کے اکثر و بیشتر اکابر علماءِ اہلِ سُنّت، شیعہ مذہب سے واقف نہ ہوسکے[1]۔ امامت کا عقیدہ جو شیعوں نے تیسری صدی ہجری میں ایجاد کیا ہے۔ اس کے اخفاء میں انہوں نے اور زیادہ کوشش کی اور اس بارے میں تقیہ سے کام لیتے رہے۔ اس وجہ سے اس دور کے اکثر علماءِ اہلِ سُنّت کو اس کا خیال بھی نہ ہوا کہ ان بزرگوں کے نام کے ساتھ "امام" اور "علیہ السّلام" کے الفاظ استعمال کرنے سے شیعوں کا باطل عقیدۂ امامت اہلِ سُنّت میں جگہ حاصل کرے گا۔ رواج عام کی بنا پر وہ حضرات بلا تکلّف یہ الفاظ استعمال کرتے رہے۔ ان کے بعد جو کبار علماء ہوئے انہوں نے بھی اپنے پیشرو اکابر علماء کی پیروی کی اور ان الفاظ کا رواج بڑھ گیا۔ مگر ان حضرات کے حاشیۂ خیال میں بھی امامت کے مذکورہ مخصوص معنیٰ نہ تھے بلکہ یہ امام بمعنیٰ مقتدا اور پیشوا استعمال کرتے تھے۔ "علیہ السّلام" بھی محض تبعاً لکھ دیتے تھے۔ جس میں اس لفظ کے لُغوی معنیٰ ملحوظ ہوتے تھے۔ جیسے ہر مسلمان کو السّلام علیکم کہتے ہیں۔ اس کا ثبوت ان بزرگوں کے حالات ہیں۔ جن پر نظر کرنے کے بعد کوئی بھی فہیم آدمی ان حضرات کے بارے میں اس قسم کا وہم نہیں کرسکتا۔ یہ حضرات اس معاملے میں معذور تھے ان پر کوئی اعتراض نہیں مگر اس معاملے میں ان کی پیروی نہ کی جائے۔ کیونکہ اب یہ واقعہ بالکل واضح ہوچکا ہے کہ ان الفاظ کے استعمال سے شیعوں کے عقیدۂ امامت کو تقویّت پہنچتی ہے۔ یعنی اہلِ سُنّت میں اس عقیدۂ باطلہ کی اشاعت ہوتی ہے۔ اور اہلِ سُنّت میں جو

[1] شیعہ علماءِ اہلِ سُنّت سے اپنے دین کو چھپاتے تھے اور ناواقف سُنّیوں میں تدریجاً اپنے عقائد و اعمال پھیلاتے تھے۔

لوگ اس سے متأثر ہیں ان کے فاسد عقیدہ کو اس سے قوت حاصل ہوتی ہے۔ اب اس روش کو ترک کرنا لازم ہے، صحیح طریقہ یہ ہے کہ حضرت علی، حضرت حسن، حضرت حسین رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی کے ساتھ حضرت یا سیدنا اور رضی اللہ عنہ لکھنا اور بولنا چاہیئے کیونکہ یہ سب حضرات صحابی ہیں۔ بزرگانِ مذکورہ میں سے باقی حضرات مثلاً حضرت زین العابدین، حضرت باقر رحمہم اللہ و امثالہم کے اسمائے گرامی کے ساتھ حضرت اور رحمہ اللہ یا قدس سرہٗ کے الفاظ جو اولیاء اللہ کے لئے استعمال ہوتے ہیں، لکھنا اور بولنا مناسب ہے۔ کیونکہ یہ حضرات صحابی نہیں ہیں، نہ مرتبہ صحابیت کے برابر رتبہ رکھتے ہیں۔ صحابہؓ کا رتبہ ان کے رتبہ سے بہت بلند و برتر ہے، ان کے اسمائے گرامی کے ساتھ رضی اللہ عنہ لکھنا بھی مناسب نہیں کیونکہ اس سے ان کی صحابیت یا اس کی مساوات کا غلط وہم پیدا ہوتا ہے۔ اس تفصیل سے روزِ روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ مذکورہ بالا حضرات علماء کے مذکورہ طرزِ عمل کو "امامت" کے باطل نظریہ سے دُور کا واسطہ بھی نہیں اور مذکورہ بالا اشکال بالکل بے بنیاد و بے اصل ہے۔ مزید روشنی کے لئے اس واقعہ پر بھی نظر کر لیجئے کہ کبار محدثین و فقہائے قدیم و اکابر علمائے اقدمین اس نادانستہ غلطی سے بھی بالکل محفوظ رہے۔ ان کے یہاں ان حضرات کے اسمائے گرامی کے ساتھ جنھیں شیعہ اپنے ائمہ کہتے ہیں، "امام" اور "علیہ السّلام" کے الفاظ نہیں ملتے۔ بطورِ نمونہ بعض علمائے عظام کی عبارتوں پر نظر کیجئے۔

— موطاء امام مالک رحمہ اللہ کتاب الزّکوٰۃ میں مذکور ہے: — "مالک عن جعفر بن محمد ابیہ ان عمرؓ ذکر المجوس الخ" — شرح زرقانی میں اس کی تفصیل اس طرح مذکور ہے: — (مالک عن جعفر بن محمد بن علی) بن الحسین بن علی بن ابی طالب (عن ابیہ) محمد الباقر الخ — ملاحظہ ہو ان دونوں اکابر نے حضرت علیؓ، حضرت حسینؓ، حضرات علی بن الحسین (المعروف بہ زین العابدینؒ) جعفر صادق اور محمد باقر رحمہم کا نام سند میں ذکر کیا۔ مگر نہ کسی کے ساتھ "امام" لقب نہ "علیہ السّلام" کے الفاظ۔

مذکورہ بالا عبارتیں بطورِ نمونہ پیش کی گئی ہیں، ورنہ قدماء کے یہاں عام طور پر یہی طریقہ تھا۔ ان حضرات کے لئے امام اور علیہ السّلام لکھنے کا رواج بہت بعد کو شیعوں کے اثر سے ہوا۔ جس کی تفصیل گذر چکی۔

بعض دوسری غلط فہمیاں | اہل سنت کے جن لوگوں نے اپنی کم فہمی کی وجہ سے امامت

کا باطل نظریہ قبول کیا وہ مختلف غلط فہمیوں میں مبتلا ہوگئے۔ ان غلطیوں کا اجمالی تذکرہ درج ذیل ہے۔ ان پر غور کرنے سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ ان سب کا سلسلۂ نسب نظریۂ امامت ہی تک پہنچتا ہے۔ ان غلط اور بے اصل خیالات کی اشاعت درحقیقت شیعوں کی طرف سے اہلِ سُنّت کو گمراہ کرنے اور انہیں اپنے باطل عقائد و افکار کی طرف لانے کیلئے بہت زور و شور کے ساتھ کی گئی اور انہیں انکے ذہنوں میں جمانے کیلئے طرح طرح کی تدبیریں کی گئیں۔ بے اصل روائتیں گھڑی گئیں اور جھوٹی کہانیاں پھیلائی گئیں۔ بعض شیعی علماء نے تقیہ کرکے خود کو سُنّی عالم مشہور کیا اور اس قسم کی جھوٹی کہانیاں گھڑ کر اہل سنّت میں پھیلائیں[1] اور اُن کے ایک گروہ کو جس میں علماء کی ایک تعداد بھی شامل ہے، گمراہ کرنے میں کامیاب بھی ہوگئے۔ شیعہ ان لوگوں کو شیعہ تو نہ بنا سکے مگر انہیں سُنّت کی راہ سے ہٹا کر شیعیت کی راہ پر ڈال دیا، وہ مرتد تو نہیں ہوئے لیکن صحیح معنی میں سُنّی بھی نہ رہے۔ منجملہ اُن کے ایک بے اصل و بے بنیاد خیال یہ ہے کہ طریق ولایت کی تعلیم نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دی تھی، اور وہ انہیں سے سینہ بسینہ منتقل ہوتا ہوا۔ زمانہ موجودہ تک پہنچا ان کے بعد ان کی اولاد میں ہونے والے دس اماموں کو مخصوص طور پر اس کے اسرار و رموز کا علم تھا اور وہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے باطنی و رُوحانی خلفاء اور سب اولیاء اللہ کے امام تھے۔ اسی غلط خیال سے یہ غلط روایت پیدا اور مشہور ہوئی کہ تصوف کے چاروں سلسلے حضرت علی رضؓ مرتضیٰ پر ختم ہوتے ہیں اور علوم ولایت میں سب اولیاء اللہ بالواسطہ یا بلاواسطہ انہیں سے مستفید ہوئے اور ہوتے ہیں۔ اور یہ کہ حضرات خلفاءِ ثلاثہ صرف ظاہری خلیفہ تھے باطنی خلیفہ صرف حضرت علی رضؓ تھے ـــــ یہ سب خیالات بالکل غلط، بے اصل اور خلافِ حقیقت ہیں۔ یہی نہیں بلکہ خود گمراہی ہونے کے ساتھ گمراہ کن بھی ہیں۔

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم سب کو تعلیم دینے کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ آنحضور علیہ السّلام نے ہر صحابی کو دین کی تعلیم دی۔ دین کا تعلق ظاہر سے بھی ہے اور باطن سے بھی اس لئے ظاہر و باطن دونوں کے متعلق احکام و اسرار اور حکمت کی تعلیم سب صحابہ کرامؓ کو بلا استثنا حاصل ہوئی۔ حضرات خلفاءِ اربعہ آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے کامل خلفاء تھے۔

---

[1] مثلاً سبط ابن الجوزی، مُلّا حُسین واعظ کاشفی وغیرہ یہ دونوں پکے شیعہ تھے۔ مگر عمر بھر خود کو سُنّی ظاہر کرکے ناواقف اہلِ سنّت میں گمراہیاں پھیلاتے رہے۔ منہ

یعنی انہیں ظاہری و باطنی دونوں قسم کی خلافت حاصل تھی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ باطنی خلافت تو ہر صحابی کو حاصل تھی۔ ممکن ہے کہ اختصار کی وجہ سے اس بات کو سمجھنے سے بعض لوگ قاصر رہیں۔ اس لئے اس کی ضروری تشریح مناسب معلوم ہوئی جو درج ذیل ہے ــــ دینِ حق کی تعلیم و تبلیغ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کا مقصد تھا۔ دینِ حق کے بعض اجزا کا تعلّق انسان کے ظاہر یعنی جسمانی حالات اور حرکات و سکنات سے ہے۔ اور بعض کا قلب و رُوح کے کیفیات و افعال سے نبی کریم علیہ الصّلوٰۃ والتّسلیم نے دین کے دونوں اجزاء یعنی دین کامل کی تعلیم و تبلیغ فرمائی اور یہ تعلیم عام تھی۔ یعنی ہر صحابی نے حاصل کی، خواہ وہ مرد ہوں یا عورت، کسی کی اس خصوصیّت نہ تھی۔

تعلیم کے بعد نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ہر صحابی کو حکم دیا کہ جو علم ظاہر و باطن انہیں حاصل ہوا دوسروں کو اس کی تعلیم دیں۔ یا ہر صحابیؓ کو عالمِ دین کے ساتھ معلّم و مبلّغ اور مُربّی و مُزکّی بھی بنا دیا گیا۔ یہی خلافتِ باطنی ہے جو ہر صحابیؓ کو عطا فرمائی گئی اور ان معنی میں ہر صحابی سیّد المرسلین علیہ الصّلوٰۃ والتّسلیم کے خلیفہ تھے۔ باسلوبِ دیگر، جن معنی میں آج کل مشائخ طریقت سے تعلیم و تربیت اور بیعت کی اجازت پانے والے اُن کے خلفاء کہے جاتے ہیں۔ ان معنی میں ہر صحابی مرد و عورت رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے خلیفہ تھے۔ حضرت ابوبکر صدّیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان ذی النّورین، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم کو جو خصوصیّت کے ساتھ خلفائے رسول کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان حضرات کو احکامِ شرعیہ کو نافذ کرنے اور عام لوگوں کو ان کا پابند بنانے کے لئے قوّت و طاقت سے کام لینے کا بھی حق اور اختیار تھا۔ ہر صحابی کو یہ اختیار حاصل نہ تھا اس لئے ان کی اس امتیازی شان کی وجہ سے خلیفۂ رسول کا لقب ان کیلئے مخصوص طور پر استعمال کیا جاتا ہے ورنہ علوم نبویہ کی تبلیغ و تعلیم اور اُمّت کی تربیت ظاہری و باطنی کے اعتبار سے ہر صحابیؓ خلیفہ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم اور آنے والی اُمّت کے رُوحانی مُربّی تھے۔ بلا استثنا رسب صحابہ کرامؓ کو نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی یہ خلافت و نیابت خود اللہ تعالیٰ کی عطا فرمائی ہوئی ہے۔ اس کا انکار کتابُ اللہ کے انکار کے مرادف اور مستلزم کُفر ہے۔ اس مضمون کے ثبوت میں متعدد آیتیں اور حدیثیں پیش کی جا سکتی ہیں، مگر بخوفِ طوالت اور بوجہ یقین کفایت صرف ایک آیت اور ایک حدیث نقل کرتا ہوں۔ بطور مدح و ستائش اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفرقان میں صحابہ کرام رضوان

اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی اس دُعا کا تذکرہ فرمایا ہے :

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ	اے ہمارے ربّ ہماری ازواج و ذرّیت سے
ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا	ہماری آنکھیں ٹھنڈی کیجیے اور متقیوں کا امام
لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ط	(مقتدا) بنا دیجیے !

مدح وستائش کی صورت میں اس کا تذکرہ بتا رہا ہے کہ یہ دُعا سب صحابہ کرامؓ کے حق میں قبول ہوئی۔ اور ہر صحابیؓ باقی اُمّت کے امام اور مقتدا ہیں۔ تقویٰ حاصل کرنے اور اس پر مستقیم وثابت قدم رہنے ، دونوں باتوں کے لئے صحابہ کرامؓ کی اقتدا کرنا واجب و لازم ہے۔ ہر صحابی اُمّت کے امام ہیں۔ یعنی اُمّت کو احکامِ شرعیہ کی تعلیم دینے والے اور اُن کی روحانی تربیت کرنے والے تھے۔ اِن احکام کا تعلّق خواہ ظاہر سے ہو یا باطن سے ان کے اس منصبِ امامت کی حقیقت نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی نیابت وخلافت ہے ، جس کی سند خود اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی۔ گویا ہر صحابیؓ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے باطنی وروحانی خلیفہ تھے۔

احادیث میں سے حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا یہ اعلانِ عام کافی ہے کہ : **لیبلغ الشاھد الغائب** - (بخاری)۔ (پس ضروری ہے کہ ہر وہ شخص جو اس وقت موجود ہے ، اُس شخص تک (میری) بات پہنچا دے جو اس وقت موجود نہیں !)

اس وقت ایک لاکھ سے زائد صحابہ کرامؓ موجود تھے۔ سب کو بلا استثنار آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے دوسروں تک یعنی اُمت کے اُن لوگوں تک جو دربارِ نبویؐ میں باریاب ہونے سے محروم رہے ، اپنا علم پہنچانے کا حکم دیا اور تا قیامت اِس علم کی بقا کا ذریعہ بنا لیا۔ یہ علم ظاہر و باطن دونوں سے تعلّق رکھتا ہے۔ اس لئے اس اعلانِ عام کا مطلب یہ ہوا کہ ہر صحابی کو آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنا خلیفہ اور باقی اُمّت کا مُعلّم و مُربّی بنا دیا۔

اس معلوم ہوگیا کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خلافت باطنی وروحانی تو ہر صحابیؓ کو حاصل تھی ، اور ہر صحابیؓ عُلومِ نبوّت و عُلومِ ولایت کے جامع تھے۔ یہ کہنا کہ علمِ ولایت صرف حضرت علیؓ کو حاصل تھا بالکل غلط اور سخت گمراہ کُن جھوٹ ہے۔ ہر صحابیؓ ولی اللہ اور ولی گر تھے اِن میں سے ہر ایک کے فیضانِ تعلیم و تربیت نے ہزاروں کو ولی اللہ بنا دیا اور اُن میں سے ہر ایک کے فیوض و برکات آج تک باقی ہیں۔

مشہور کیا گیا ہے کہ سلوک و تصوّف کے سب سلسلے حضرت حسن بصری رحمۃُ اللہ پر مُنتہی ہوتے

ہیں، اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مُرید تھے اور انہیں سے مستفید ہوئے۔ مگر یہ سب واقف کی مشہور کی ہوئی غلط افواہیں ہیں، جن سے بعض سُنّی صوفیاء بھی مُتأثر ہو گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ سب سلسلے حضرت حسن بصریؒ پر منتہی نہیں ہوتے۔ بکثرت دوسرے حضرات کے سلسلے بھی موجود ہیں خصوصاً شام میں اکثر سلسلے ایسے ہی ہیں جن میں حسن بصریؒ کا کہیں نام نہیں آتا۔ اس کے علاوہ حضرت حسن بصریؒ کا حضرت علیؓ سے استفادہ کرنا بھی ثابت نہیں۔ "تہذیب التہذیب" میں موصوف کا تذکرہ دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ موصوف نے حضرت علیؓ کو اپنے بچپن میں دیکھا تھا۔ مگر مصاحبت و استفادہ کا موقع نہیں ملا، کیونکہ آں محترم کوفہ تشریف لے گئے۔ بخلاف اس کے صحابہؓ میں حضرت عبداللہ ابن عمر، حضرت انس بن مالک، حضرت عبداللہ بن مغفل، حضرت عمرو بن تغلب، حضرت ابوبرزہ اسلمی رضی اللہ عنہم سے حضرت حسن بصریؒ کا سماع اور استفادہ ثابت ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ اس وقت پیری مُریدی کا یہ طریقہ رائج نہ تھا جو آج کل مروّج ہے۔ مدرسے اور خانقاہیں الگ الگ نہ تھیں۔ حضرات صحابہؓ علمِ ظاہر و باطن دونوں کی تعلیم ایک ساتھ دیتے تھے۔ حضرت حسن بصریؒ نے ان حضرات سے دونوں علم حاصل کئے اور ولایت و سلوک کے نکات بھی ان سب حضرات سے سیکھے اس وقت یہ طریقہ بھی نہ تھا کہ آدمی صرف ایک ہی شیخ سے تعلق رکھے۔ بلکہ طالب متعدد مشائخ سے استفادہ کرتا تھا۔ گو آج کل کی اصطلاح کے لحاظ سے موصوف ان سب حضرات کے شاگرد بھی تھے اور مُرید بھی۔

اس سلسلہ میں شیعوں نے ایک جھوٹی افواہ یہ مشہور کی کہ حضرت بایزید بسطامیؒ نے حضرت جعفر صادقؒ سے استفادہ کیا، یہ سفید جھوٹ ہے۔ حیرت ہے کہ اس قدر کھُلی ہوئی غلط بیانی کی جرأت انہیں کیسے ہوئی، کسی نے سچ کہا ہے کہ: "بے حیا باش و ہرچہ خواہی کُن!" مطلب یہ ہے کہ آدمی جب بے حیا ہو جاتا ہے تو سب کچھ کر سکتا ہے۔ "الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ" میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس صریح غلط بیانی کی پُرزور تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت بایزید بسطامیؒ تو حضرت جعفر صادق کی وفات کے بہت دن کے بعد پیدا ہوئے۔ ان کے زمانہ میں تو حضرت بسطامی کا نام و نشان بھی نہ تھا، اُن سے استفادہ کیسے کرتے۔

مختصر یہ کہ عُلومِ ولایت و سُلوک کو شیعوں کے ان مزعومہ ائمہ کے ساتھ مخصوص سمجھنا اور سب سلسلوں کا سرا انہیں سے ملا دینا بالکل غلط ہے۔ بلکہ اسی میں کلام ہے کہ ان میں سے حضرت علی، حضرت حسن، حضرت حسین رضی اللہ عنہم کو مستثنیٰ کر کے شیعوں کے باقی

مزعومہ ائمہ تعلیم باطن کا ملکہ بھی رکھتے تھے یا نہیں؟ بزرگ اور صالح ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ آدمی دوسرے کی اصلاح و تعلیم کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔

شیعوں نے جناب باقرؒ اور جناب جعفر صادقؒ کی تعریف بہت مبالغہ اور غلو کے ساتھ کی۔ اس کا اثر اہل سنت پر بھی پڑا۔ بعض اہل سنت نے بھی ان دونوں حضرات خصوصاً حضرت جعفر صادقؒ کے متعلق غلو میں مبتلا ہو کر شیعوں کی بعض غلط بیانیوں کو صحیح سمجھ لیا۔ اس غلط بیانی کا ایک قابل تذکرہ نمونہ یہ ہے کہ شیعہ اپنے مزعومہ ائمہ کو جو ہمارے ائمہ اربعہ کے معاصر تھے، ان حضرات سے افضل ظاہر کرتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ ناواقف اہل سنت کے دل میں حضرات ائمہ اربعہ کی وقعت کم کی جائے تاکہ وہ جذبۂ خود حقارتی کا شکار ہو کر اُن کے مزعومہ فرضی اماموں کی طرف مائل ہوں اور رافضیت کی راہ پر پڑ جائیں۔

امام ابن تیمیہ قدس سرہٗ نے "منہاج السنۃ" میں اس کھلی ہوئی غلط بیانی پر بہت کاری ضرب لگائی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر یہ حضرات علم و فضل میں ہمارے چاروں اماموں میں سے کسی کے برابر بھی ہوتے تو اہل سنت میں کچھ نہ کچھ لوگ اُن کے مقلد اور پیرو بھی ہوتے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی مسلمانوں سے تو دنیائے اسلام بھری پڑی ہے، مگر دنیا کے کسی گوشہ میں بھی کسی باقری یا جعفری سُنّی کا نام و نشان نہیں ملتا اور کسی زمانہ میں بھی نہیں ملا۔ یہاں تک کہ جو سُنّی باعتبار نسب جعفری کاظمی زیدی وغیرہ ہیں۔ وہ بھی ان حضرات کی تقلید نہیں کرتے۔ اسی طرح کا ایک جھوٹ یہ مشہور کیا گیا کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ کے شاگرد تھے، یہ بھی بالکل غلط اور شیعی افترا ہے۔ اگر انہوں نے یا امام مالک رحمہ اللہ نے ان سے دو چار روایتیں لے لیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اُن کے شاگرد ہو گئے۔ یہ سب حضرات معاصرین جب ملتے تھے تو علمی گفتگو بھی کرتے تھے۔ اس کا نام اسنادی شاگرد نہیں۔ محدثین و فقہاء اپنے سے کم درجہ کے لوگوں سے بھی روایت لیتے تھے۔ پھر یہ کہ حضرت باقرؒ اور حضرت جعفر صادقؒ نے بھی ہمارے

لہ فقہ جعفر کے نام سے آج کل جس چیز کو شہرت دی جا رہی ہے وہ شیعوں کا من گھڑت مجموعہ مسائل ہے۔ حضرت جعفر صادق کا کوئی مخصوص علم فقہ نہ تھا، نہ وہ اس درجہ کے مجتہد تھے کہ اُن کا کوئی مخصوص علم فقہ ہوتا۔ ان کے انتقال کے بہت زمانہ کے بعد شیعوں نے کچھ مسائل کتب اہل سنت سے سرقہ کر کے اور کچھ اپنی طرف سے گھڑ کے اُن کی نسبت حضرت جعفر صادقؒ کی طرف کر دی۔ اسی کا نام "فقہ جعفری" ہے۔ منہ!

ان دونوں اماموں کے علم و تفقہ سے فائدہ اٹھایا ہے۔ حق یہ ہے کہ ہمارے ان دونوں اماموں کا رتبہ حضرت باقرؒ و جعفرؒ سے بلند و برتر ہے، بلکہ ہمارے چاروں امام ان حضرات اور ان کے بعد کے شیعوں کے مزعومہ اماموں سے افضل و برتر ہیں۔ اسی طرح شیعی پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر بعض سُنّی علماء نے بھی امامِ اعظم کی طرف یہ بات منسوب کردی کہ "اگر میں دو سال تک حضرت جعفر صادقؒ کے ساتھ نہ رہتا تو ہلاک ہوجاتا۔" یہ امامِ اعظمؒ پر افتراء ہے۔ اس کے غلط ہونے کے لئے اتنا ہی ثبوت کافی ہے کہ آنمحترم اور حضرت جعفرؒ کا ساتھ کبھی چند روز سے زیادہ نہیں رہا۔ دو سال تو کیا، سال چھ ماہ بھی کبھی دونوں کا ساتھ نہیں رہا۔

بعض اہلِ سُنّت جو مندرجہ بالا غلط فہمیوں میں مبتلا ہوگئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے شیعوں کے نظریۂ امامت کو کچھ تبدیلی کے ساتھ قبول کرلیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ انہیں حضرت باقرؒ اور حضرت جعفر صادقؒ کے ساتھ عقیدت میں غلو ہوگیا۔ ان حضرات کے ساتھ عقیدت تو رکھنا چاہئے کیونکہ یہ حضرات صالح اور متقی علماءِ دین تھے۔ مگر اس عقیدت میں غُلو اور حد سے تجاوز کرنا کسی طرح درست نہیں تھا۔ فقط وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

مولانا احمد علی لاہوریؒ کی سوانح کیلئے مواد درکار ہے!

دورِ حاضر کے ولی اللہ اور مجاہدِ جلیل مولانا احمد علی شیخ التفسیر لاہوری قدس سرہٗ کے شایانِ شان جامع اور مکمل سوانح اب تک تیار نہیں ہوسکی۔ اس تمنا کو لئے ہوئے احقر تمام اہلِ علم واقفین اور متوسلین شیخ التفسیرؒ سے ملتجی ہے کہ مجھے حضرتِ شیخ کی سوانح کے بارے میں اُن کی حیاتِ مبارکہ کے متعلق ہر قسم کی معلومات درکار ہیں۔ نیز حضرتؒ کے ہر قسم کے خطوط اور مکتوبات، ان خطوط کے پس منظر، حضرتؒ کے ملفوظات، غیر مطبوعہ مواعظ و تقاریر، رُوحانی عملیات و وظائف، کرامات، کسی کتاب یا رسالہ یا ادارے کے بارے میں حضرتؒ کی تقاریظ و آراء سے جلد از جلد ممنون فرمائیں۔ حضرتؒ کی تحریرات کے فوٹوسٹیٹ یا اصل کاپی ارسال فرمائیں جسے بحفاظت واپس کردیا جائے گا۔ کسی کے پاس ٹیپ ریکارڈ میں حضرتؒ کی تقریر، درس یا گفتگو محفوظ ہو تو اس سے بھی مطلع فرمائیں۔ اُمید ہے کہ ایک نابغۂ عصر شخصیت کی جامع اور ہمہ پہلو سوانح کی جلد تکمیل میں تمام اہلِ علم اور حضرتؒ کے معتقدین مواد مہیا فرمانے میں مدد فرمائیں گے!

(احقر احمد عبدالرحمٰن صدیقی فاضل حقانیہ۔ مکتبۂ حکمتِ اسلامیہ نوشہرہ صدر)

امام
محمد بن جریر الطبری

محترمہ جمیلہ شوکت
(شعبۂ علوم اسلامیہ، جامعہ پنجاب)

ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید بن کثیر بن غالب الطبری، طبرستان[1] کے شہر "آمل" میں ۲۲۴ھ میں پیدا ہوئے۔ نشوونما "آمل" میں ہوئی اور ابتدائی علوم بھی یہاں حاصل کئے۔ جب بارہ[2] سال کے ہوئے تو حصولِ علم کے لئے مختلف امصار و علاقوں کے سفر کئے اور پھر بغداد میں سکونت اختیار کی۔ بغداد میں ان کے مشاغل درس[3] تدریس اور تصنیف و تالیف تھے۔ حتیٰ[4] کہ ۳۱۰ھ میں بغداد ہی میں وفات پائی۔ وفات کے بعد کئی ماہ تک شب و روز لوگ ان کی قبر پر نماز جنازہ ادا کرتے رہے، مرثیے بھی[5] لکھے گئے

علّامہ ابن جریر ایک جیّد عالم تھے۔ علوم دینیہ اور عصری علوم پر دسترس حاصل تھی۔ ان کے تبحرِ علمی کا اعتراف متقدّمین و متاخرین علماء نے کیا ہے۔ عبدالعزیز طبری ان کی شان میں فرماتے ہیں: كان كالقارئ الذى لا يعرف الّا القرآن وكالمحدث الذى لا يعرف الّا الحديث، وكالفقيه الذى لا يعرف الّا الفقه، وكالنحوى الذى لا يعرف الّا النحو، وكالحاسب الذى لا يعرف الّا الحساب وكا عالما بالعبادات جامعا للعلوم[6]۔ ابن خلکان رقم طراز ہیں: كان اماما فى فنون كثيرة منها التفسير والحديث والفقه والتاريخ وغيره ذالك وله مصنّفات مليحة فى فنون متعدّدة تدل على سعة علمه وغزارة فضله[5]۔ علّامہ سبکی بھی ان کی علمیت کے اعتراف

---

[1] یاقوت حموی: معجم البلدان ۱۳ : ۱۳ بیروت، ۱۹۵۷ء ❊
[2] " : " ۳ : ۴۵۶، بیروت ❊
[3] تاج الدّین سبکی: طبقات الکبریٰ ۲ : ۱۳۵، معجم الادباء ۱۸ : ۴۰
تاریخ بغداد ۲ : ۱۶۳، لسان المیزان ۵ : ۱۰۰ - تذکرۃ الحفاظ ۱ : ۲۵۱ ❊

میں خطیب بغدادی کا قول نقل کرتے ہیں : احد الائمۃ یحکم بقوله ویرجع الی رأیه لمعرفته وفضله وجمع من العلوم مالم یشارکه فیه احد من اهل عصره وکان حافظا لکتاب الله بصیرًا بالمعانی فقیهًا فی الاحکام، عالمًا بالسنن وطرقها وصحیحها وسقیمها وناسخها ومنسوخها، عارفا باقوال الصحابة والتابعین ومن بعدهم من المخالفین من الاحکام والمسائل الحلال والحرام[۶] — ابن خزیمہ ان کی تبحرِ علمی کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں : ما اعلم علی الارض اعلم من محمد بن جریر الطبری[۷] — صاحبِ شذرات ان کو الحبر، البحر، الامام ایسے عظیم خطابات سے یاد کرتے ہیں[۸]۔

ابن جریر ابتدا میں شافعی مسلک کے پیروکار تھے، لیکن یہ پیروی تقلید کی حد تک نہیں تھی - بعدازاں ابن جریر نے ایک علیحدہ فقہی مکتبِ فکر کی بنیاد رکھی[۹]۔ اور متبعین کا ایک وسیع حلقہ پیدا ہوگیا- ابن جریر بڑے حق گو اور جری تھے جس کی وجہ سے جاہل عوام اور بعض دیگر اسباب کی بنا پر حنابلہ بھی ان کے دشمن ہوگئے اور ان پر مختلف قسم کے الزامات لگائے- دشمنوں نے ان پر الحاد کا الزام لگایا لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ یہ لوگ الحاد کے معانی تک سے ناواقف[۱۰] تھے- اسی طرح بعض لوگوں نے تشیع کا الزام بھی لگایا اور یہ تک کہہ دیا کہ : کان الطبری یضع للروافض[۱۱]- علامہ ابن جریر پر اس اتہام کی تائید یاقوت حموی کے اس قول : ودفن لیلًا خوفا من العامة لانه یتهم بالتشیع[۱۲] سے بھی ہوجاتی ہے- ابن حجر اور دیگر اہل علم نے اس الزام کو ردّ کیا ہے- ابن حجر اس اتہام کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے ہیں کہ شیعیت کی طرف نسبت کا ایک اہم سبب ان کا ہم نام ایک رافضی شخص[۱۳] تھا- بعض لوگوں نے ابن جریر کو

---

۶ طبقات الکبریٰ، ۲ : ۱۳۵، تاریخ بغداد ۲ : ۱۶۳، تذکرۃ الحفاظ ۲ : ۲۵۱، معجم الادباء، ۱۸ : ۴۱ ۷ شذرات الذہب ۲ : ۲۶۰
۸ شذرات الذہب ۲ : ۲۶۰ ۹ طبقات المفسرین ۳۰، الوافی ۲ : ۲۴۰، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ۴ : ۵۷۸، انسائیکلو پیڈیا آف برٹنیکا ۲۱ : ۷۲۹
۱۰ البدایہ والنہایہ ۱۱ : ۱۴۵ ۱۱ لسان المیزان ۵ : ۱۰۰ —
۱۲ معجم الادباء ۱۸ : ۴۱ ۱۳ لسان المیزان ۵ : ۱۰۳، میزان اعتدال ۳ : ۴۹۹

عقیدۂ جبر سے بھی متہم کیا ہے لیکن علامہ ابن جریر کی اپنی تصانیف بالخصوص ان کی تفسیر سے اس الزام کی تردید ہو جاتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ علامہ ابن جریر سُنّی المسلک مسلمان تھے۔ جیسا کہ یاقوت کہتے ہیں: کان ابوجعفر یذھب فی جل مذاھبہ الی ماعلیہ الجماعۃ من السلف وطریق اھل العلم متمسکین بالسنن[14] ان کے سلفی العقیدہ ہونے کی تائید ان کی تفسیر سے بھی جابجا ہو جاتی ہے۔

علامہ ابن جریر کثیر التصانیف مصنف ہیں جیسا کہ ابن خلکان کہتے ہیں: ولہ مصنفات ملیحۃ فی فنون متعددۃ[15] — یہ تصانیف مختلف موضوعات پر تھیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی شہرت کا مدار ان کی تفسیر[16] اور تاریخ پر ہے۔ اس وقت صرف ان کی تفسیر اور اس کی خصوصیات کا اجمالی سا ذکر ہو گا۔

ابن جریر کی تفسیر کا پورا نام "جامع البیان فی تفسیر القرآن" ہے[17] لیکن مؤلف کی نسبت سے "تفسیر طبری" کے نام سے معروف ہے۔ تفسیر کا آغاز ۲۸۳ھ میں ہوا اور ۲۹۰ھ میں مکمل کی۔ مؤلف نے تفسیر کو جس شوق اور لگن سے تالیف کیا، اس کا اندازہ ابن جریر کے اس قول سے ہو جاتا ہے، کہتے ہیں: "ابھی مَیں بچہ ہی تھا تو ایک تفسیر لکھنے کا شوق میرے دل میں پیدا ہو گیا تھا۔ جب لکھنے کا عزم کیا تو اللہ تعالیٰ سے استخارہ کیا۔ اور شروع کرنے سے قبل تین سال تک اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ مجھے استقامت عطا فرمائے اور اس کام میں میری اعانت فرمائے۔"

یہ تفسیر تیس[18] ضخیم جلدوں میں متداول ہے۔ ابن جریر کا ارادہ تو ضخیم تر تفسیر لکھنے کا تھا، لیکن احباب اور شاگردوں کی درخواست پر اسے مختصر کر دیا۔ جیسا کہ خطیب بیان کرتے ہیں کہ ان کے احباب نے تفسیر کے بارے میں دریافت کیا کہ: کم یکون قدرہ، قال: ثلاثون الف ورقۃ، قالوا ھذا مما یفنی الاعمار قبل تمامہ فاختصرہ فی نحو ثلثۃ الاف ورقۃ[20] — یہ تفسیر مصر سے متعدد بار چھپ چکی ہے۔ مصحف کی ترتیب کے مطابق مکمل قرآن کی پہلی وہ جامع تفسیر ہے جو ہم تک پہنچی ہے۔ مؤلف نے اپنی اس

---

[15] وفیات الاعیان ۲: ۲۳۲ [16] ابن جریر نے تاریخ الامم سے قبل تفسیر لکھی۔ [17] اپنی تاریخ میں تفسیر کا نام "جامع البیان عن تاویل ای القرآن" بیان کیا ہے، جس کی تائید یاقوت کی روایت سے بھی ہو جاتی ہے۔ التاریخ ۱: ۸۹، معجم الادباء ۱۸: ۴۴

یگانۂ روزگار مفسر ہیں ماقبل مفسرین کے تفسیری سرمایہ کو جمع و محفوظ کر دیا ہے جیسا کہ زرقانی کہتے ہیں : ابن جریر جمع علی الناس اشتہات التفاسیر وقرب البعید[۲۱]
تفسیر طبری تفسیر ماثور کی نمائندہ تفسیر ہے۔ جیسا کہ احمد امین کہتے ہیں : بلغ ابن جریر الذروۃ فی التفسیر بالماثور[۲۲] ۔ مستشرق گولڈزیہر کا کہنا ہے : ولدینا فی ھٰذا الکتاب دائرۃ معارف غزیر المثورہ من التفسیر الماثور[۲۳]

انسائیکلو پیڈیا آف امریکہ[۲۴] برٹینکا اور اسلام کے مقالہ نگار حضرات نے تفسیر ابن جریر کی تعریف کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مؤلف نے اپنی تفسیر میں ماقبل مفسرین کی تمام روایات کو جمع کر دیا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں ہے : IN HIS TAFSIR HE COLLECTED FOR THE FIRIST TIME THE AMPLE MATERIAL OF TRADITIONAL EXEGESIS AND THIS CREATED A STANDARD WORK UPON WHICH LATER KORANIC COMMENTARIES DREW.[۲۵]
لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ابن جریر نے اپنی تفسیر میں محض نقل روایت پر اکتفا کیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے زمانہ کے مروجہ طریقہ سے ہٹ کر ذاتی اجتہاد سے کام لیا ہے اور بعض روایات کو بعض پر ترجیح بھی دی ہے سو اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے اپنی تفسیر میں روایت و درایت کو جمع کر دیا ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ جیسا کہ داؤد المالکی کہتے ہیں : انہ جمع بین الروایۃ والدرایۃ ولم یشارکہ فی ذٰلک احد قبلہ ولا بعدہ[۲۶]۔ علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں : ھو من اجل التفاسیر واعظمہا فانہ یتعرض لتوجیہ الاقوال وترجیح بعضہا علی بعض والاعراب والاستنباط فھو یفوق بذلک تفاسیر الاقدمین[۲۷] ۔ احمد امین ان کی تفسیر کی ان منفرد خصوصیات

۲۱ مناہل العرفان : ۱ : ۴۹۷ ، البرہان فی علوم القرآن ۲ : ۱۵۹ ؛
۲۲ ظہر الاسلام ، ۲ : ۱۴۱ ۔ ۲۳ المذاہب الاسلامیہ فی تفسیر القرآن ص ۱۰۹ ۔
۲۴ انسائیکلوپیڈیا آف امریکا ، ۲۶ : ۲۰۰ ۔ انسائیکلوپیڈیا آف برٹینکا ۲۱ : ۸۴۷ ۔ ۲۵ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ، ۴ : ۵۷۸ ۔ ۲۶ طبقات المفسرین ۲ : ۱۳۰ ۔
۲۷ الاتقان فی علوم القرآن ، ۲ : ۱۹۰ ۔

کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں: قد جمع فیه کثیرًا مجموعات التفسیر التی سبقه وفاضل بین روایاتها واختار امثلها، جمع فیه ما روته مدرسة ابن عباس ومدرسة علی بن ابی طالب وابن مسعود واستفاد مما جمعه ابن جریج ..... ثم زاد علی ذلك ما وصل الیه فی عصره من اعراب واستنباط فتراه یجمع الصحابه والتابعین فی التفسیر[28] ابن جریرؒ نے اپنی تفسیر میں سلف کے اقوال صحیح اسناد کے ساتھ پیش کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ اگر کسی سند پر اطمینان نہ ہو تو بعض اوقات اس کی طرف بھی اشارہ کر دیتے ہیں۔ لیکن وہ متہم راویوں مثلاً مقاتل بن سلیمان وغیرہ سے روایت نہیں کرتے، جیسا کہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ بھی فرماتے ہیں: واما التفاسیر التی فی ایدی الناس فاصحها تفسیر محمد بن جریر فانه یذکر مقالات السلف بالاسانید الثابتة ولیس فی بدعة ولا ینقل عن المتهمین کمقاتل بن سلیمان والکلبی[29]۔ تفسیر طبری کی خصوصیات کی بنا پر متقدمین و متاخرین علماء نے اسے لاثانی قرار دیا ہے۔ امام نوویؒ کا قول ہے: اجمعت الامة علی انه لم یصنف مثل تفسیر الطبری[30]۔ علامہ سیوطیؒ تفسیر طبری کو نہایت قابلِ اعتماد تفسیر قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں: لم یولف فی التفسیر مثله[31]۔ ابن ندیم اور ابن الاثیر بھی تفسیر کو منفرد قرار دیتے ہیں[32]۔ ابو حامد الاسفرائینی کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص اس کتاب کے حصول کے لئے دُور دراز کا سفر اختیار کرے تو یہ معمولی بات ہوگی[33]۔ بعد میں آنے والے تمام مفسرین نے اس تفسیر سے کسی نہ کسی طرح استفادہ کیا ہے جو اس کی اہمیت اور مقبولیت پر واضح دلیل ہے اور جس کا اظہار احمد الاسکندری اور انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار نے بھی کیا ہے[34]۔

ابن جریر نے اپنی تفسیر میں قرآن سے متعلق اس عہد تک کے تمام مباحث اور موضوعات کو شامل کر کے اسے قرآنی خزینہ بنا دیا۔ دوران تفسیر وہ علم قرأت، تجوید، صرف و

---

۲۸ ضحی الاسلام، ۲: ۱۴۹ ÷ ۲۹ فتاوی ابن تیمیه، ۲: ۱۹۲ ÷
۳۰ الاتقان، ۲: ۱۹۰ ÷ ۳۱ الاتقان، ۲: ۱۹۰
۳۲ الفهرست، ۳۴۱ ÷ البدایة والنهایه، ۱۱: ۱۴۵
۳۳ تذکرة الحفاظ، ۲: ۲۵۲ ÷ تاریخ بغداد، ۲: ۱۶۳ ÷ معجم الادباء ۱۸: ۴۲ ÷
۳۴ الوسیط فی تاریخ آداب اللغة العربیة، ۲۳۶، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ۴: ۸

نحو، لغت، فقہ، عقائد، علم کلام اور علوم طبعیہ وغیرہ مسائل پر سیر حاصل بحث کرتے ہیں تفسیر شروع کرنے سے قبل ابن جریر نے ایک جامع اور طویل مقدمہ لکھا ہے جس میں قرآن حکیم کی فصاحت و بلاغت، ناسخ و منسوخ، احکام القرآن، سبعۃ احرف وغیرہ سے بحث کی ہے۔

ابن جریر کا انداز تفسیر یہ ہے کہ جب وہ کسی آیت کی تشریح و توضیح کرتے ہیں تو کسی ایک لفظ کے بارے میں مختلف طرق سے اسناد کے ساتھ مختلف معانی درج کرتے ہیں۔ جو اپنی جگہ بڑے اہم ہوتے ہیں اور پھر وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اجتہاد سے کام لیتے ہوئے سب سے مناسب معنی کی طرف بھی اشارہ کر دیتے ہیں جیسا کہ مندرجہ مثالوں سے واضح ہو جائے گا۔

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً[۳۵] کی تشریح کرتے ہوئے لفظ "السلم" کے مختلف معانی بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ زیادہ موزوں و مناسب معنی اسلام[۳۶] کے ہیں۔

لَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِیْنَ اعْتَدَوْا ...[۳۷] کی تشریح میں ابن عباس کا قول بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی سرکشی کی وجہ سے بندر بنا دیا۔ جبکہ مجاہد کہتے ہیں کہ آیت سے مراد صورتاً بندر بنانا نہیں بلکہ بطور مثال اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے۔ ابن جریر ابن عباس کے مفہوم کی تائید کرتے ہوئے مجاہد کے قول کے بارے میں رقم طراز ہیں: هٰذا القول مخالف الظاهر مادلّ علیه کتاب الله وذلك أن الله اخبر في کتابه أنه جعل منهم القردة والخنازیر وعبد الطاغوت کما أخبر أنهم قالوا لنبیّهم أرنا الله جهرة[۳۸]

او یعفو الذی بیده عقدة النکاح[۳۹] کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بعض نے ولی اور بعض نے شوہر مراد لیا ہے۔ ان تمام روایات کا ذکر کرتے ہیں جو ان دو مفاہیم پر دلالت کرتی ہیں، پھر کہتے ہیں: وأولی القولین فی ذلك بالصواب قول من قال: المعنی لقوله "الذی بیده عقدة النکاح" الزوج وذلك لاجماع الجمیع علی أن ولی

---

۳۵ البقرہ ۲۰۸ ؛ ۳۶ تفسیر الطبری، ۲ : ۳۲۳ - ۳۲۵ ؛ ۳۷ البقرہ : ۶۵
۳۸ تفسیر الطبری، ۱ : ۲۶۴ ؛ ۳۹ البقرہ : ۲۳۷ ؛

جاریہ بکر او ثیب جیبة صغیرہ کانت او مدرکہ کبیرہ لو ابتو ازوجھا من مھرھا قبل طلاقہ ایاھا، او وھبہ لہ او عفا لہ عنہ ان ابراءہ ذلک وعفوہ لہ عنہ باطل و ان صداقھا علیہ ثابت[140] - ابن جریر دوران تفسیر اگرچہ عقل و رائے کا استعمال کرتے ہیں لیکن وہ ایسی تفسیر بالرائے کے حق میں نہیں جس سے قرآن کو ذاتی آراء و خواہشات کا تابع بنا لیا جائے۔ ایسی تفسیر بالرائے کو وہ مذموم سمجھتے ہیں۔ مقدمہ تفسیر میں بھی تفسیر بالرائے کا موضوع باندھا ہے جس میں ان روایات کا ذکر کرتے ہیں جو ایسی تفسیر پر قدغن لگاتی ہیں۔

ابن جریر نے ہم عصر کبار محدثین سے استفادہ کیا حتیٰ کہ خود اُن کا شمار بھی زمرۂ محدثین میں ہونے لگا۔ اس فن پر ایک بیش قیمت کتاب "تہذیب الآثار" بھی تالیف کی۔ علمِ حدیث پر ان کی دسترس کا اندازہ اُن کی تفسیر سے بھی ہو جاتا ہے۔ ابن جریر کا تفسیر میں طریقہ ہے کہ جب کسی لفظ یا آیت کا مفہوم سنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جائے تو وہ تمام مصادر سے اعراض کر لیتے ہیں۔ دورانِ تفسیر حدیث کے مستند اور متداول مجموعوں پر اعتماد کیا ہے : اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ[141] کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہاں "ظُلم" سے مراد شرک ہے۔ پھر وہ اس معانی کی تائید میں اس حدیث کو روایت کرتے ہیں جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ظلم سے مراد شرک ہے[142]۔

ان کی تفسیر میں لُغوی اور نحوی بحثیں بھی ملتی ہیں۔ طبری کے زمانے میں عقلیت زوروں پر تھی، علوم و فنون کا بازار گرم تھا، کوفہ اور بصرہ کے نحویوں کے درمیان رسہ کشی ہو رہی تھی۔ انہوں نے اپنی تفسیر میں ان مباحث کو یوں سمیٹا کہ آیت متعلقہ میں علمائے نحو و صرف کے مذاہب بیان کر دیئے اور عربوں کے اسلوبِ استعمال کی وضاحت بھی کر دی۔ وَاَرْسَلَ عَلَیْھِمْ طَیْرًا ...[143] مِنْ سِجِّیْلٍ کی تشریح کرتے ہوئے "سِجِّیْل" کے مختلف معانی بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بعض لوگوں نے اس سے آسمانِ دُنیا مراد لیا ہے : وھذا القول لانعرف لصحتہ وجھا فی خبر ولا عقل ولا لغۃ و اسماء الاشیاء لا تدرک الّا

---

[140] تفسیر الطبری، ۲ : ۴۷۵ ؛ [141] الانعام : ۸۲ ؛ [142] تفسیر الطبری ۱۱ : ۴۹۴، دار المعارف ؛ [143] الفیل : ۳ ؛

من لغۃ سائرۃ او خبر۔ بعض وقت وہ مختلف مذاہب کا ذکر کرنے کے بعد کسی ایک مذہب کو ترجیح بھی دیتے ہیں مثلاً قَدْ كَانَتْ اٰيَاتِيْ[45]... مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ٥ کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس آیت میں سٰمِرًا بطورِ واحد کے کیوں آیا ہے جب کہ مستکبرین کی طرح جمع آنا چاہیے تھا۔ ابن جریر اس کا جواب دیتے ہیں کہ یہاں سٰمِرًا بمعنی وقت ہے کہ تم لوگ رات کو یاوہ گوئی کے مرتکب ہوتے تھے، اس کو واحد لائے ہیں اس کے بعد اپنے قول پر کلامِ عرب سے استدلال بھی کرتے ہیں[46]۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا... ثُمَّ عَرَضَهُمْ[47]... اسماء کی تشریح میں مختلف اقوال کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ یہاں "هُمْ" کی ضمیر اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہ اسماء حضرت آدمؑ کی ذرّیت یا فرشتوں کے تھے[48]۔

ابن جریر دورانِ تفسیر اشعارِ عرب سے بھی بکثرت استشہاد کرتے ہیں۔ اس طریقہ میں ابن جریر نے عظیم مفسّر صحابی حضرت عبد اللہ ابن عباس کا تتبع کیا ہے۔ کبھی وہ شاعر کا نام ذکر کرتے ہیں اور کبھی صرف قال الشاعر پر اکتفا کرتے ہیں۔ مثلاً لفظ سورۃ کے معنی بلند مقام کرتے ہیں اور استشہاد نابغہ ذبیانی کے شعر سے کرتے ہیں۔ اسی طرح آیت کے معنی بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کلامِ عرب میں یہ بمعنی علامت اور خبر کے استعمال ہوا ہے اور پھر وہ ثبوت میں اشعار پیش کرتے ہیں[49]۔ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ[50] کی توضیح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عرب "جید" بمعنی گردن استعمال کرتے ہیں اور پھر ذو الرّمہ کے شعر سے استشہاد کرتے ہیں[51]۔ وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا[52] کی تفسیر کرتے ہوئے لفظ جَمًّا کے مفہوم پر زہیر بن ابی سلمیٰ کا شعر پیش کرتے ہیں[53]۔ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ[54] کی تشریح کرتے ہوئے لفظِ کرسی کے مختلف معانی بیان کرتے ہیں اور ہر معنی پر شعر سے استشہاد کرتے ہیں[55]۔

ابنِ جریر عالمِ قراءات تھے۔ وہ مختلف امصار کے قُرّاء کی قراءات سے بخوبی

---

[45] مومنون: ۶۶، ۶۷ ؛ [46] تفسیر الطبری: ۱۸ [47] البقرہ: ۳۱ ؛
[48] تفسیر الطبری ۱: ۲۱۶ مطبعہ البابی الحلبی ؛ [49] تفسیر الطبری ۱: ۱۰۶ مطبع دار المعارف، مصر ؛ [50] اللھب: ۵ ؛ [51] تفسیر الطبری، ۳۰: ۲۲۰ ؛
[52] الفجر: ۲۰ ؛ [53] ایضاً، ۳۰: ۱۸۴ ؛

آگاہ تھے۔ دورانِ تفسیر وہ کسی لفظ کی قراءات کے اختلاف[۵۶] کا ذکر کرتے اور بعض کو بعض پر ترجیح دیتے نظر آتے ہیں۔ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ أَنُلْزِمُكُمُوهَا کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کوفہ کے قرّاء "عُمِّيت" 'ع' کے ضمّہ 'م' کی تشدید کے ساتھ پڑھتے ہیں جبکہ بعض بصرہ اور کوفہ کے قُرّا 'ع' کی زبر اور 'م' کو تخفیف کے ساتھ پڑھتے ہیں ــــ وہ اوّل الذکر قراءات کو ترجیح دیتے ہوئے کہتے ہیں : وأولى القراءتين في ذلك عندي بالصواب قراءة من قرأ "فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ" بضمّ العين وتشديد الميم للذي ذكروا من العلّة ومن قرأيه وتقريره من قوله "أرأيتم إن كنت على بيّنة من ربّي وآتاني رحمة من عنده" فأضاف الرحمة إلى الله فكذلك تعميته على الآخرين بالإضافة إليه أولى[۵۷]۔

اسی طرح آیت إِنِّي أَرَى فِي الْمَنَامِ ... فَانْظُرْ مَاذَا تَرَى[۵۸] کی قراءت میں قراء کا اختلاف بیان کرتے ہیں کہ بعض نے 'ت' کی زبر سے بمعنی "اب تم کس چیز کا حکم دیتے ہو!" پڑھا ـ جبکہ بعض نے 'ت' کو ضمّہ کے ساتھ بمعنی "اب تمہاری کیا رائے اور مشورہ ہے!" پڑھا ہے ــــ اس کے بعد وہ اوّل الذکر قراءت کو ترجیح دیتے ہیں اور وجہِ ترجیح بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں : فان قال قائل أو كان ابراهيم يؤامر ابنه في المضي لأمر الله والانتهاء الى طاعته ؟ قيل لم يكن ذلك من مشاورة لابنه في طاعة الله ، ولكنه كان منه ليعلم ما عند ابنه من العزم هل هو من الصبر على أمر الله على مثل الذي هو عليه فيسر بذلك أم لا، وهو في الأحوال كلها ماض لأمر الله[۵۹]

آیت لا يلتكم من أعمالكم شيئاً[۶۰] کے بارے میں کہتے ہیں کہ بعض قراء نے اسے يلتكم اور بعض نے يألتكم پڑھا ہے۔ بعض وجوہ کی بنا پر اوّل الذکر قراءت کو ترجیح دیتے ہیں۔[۶۱] ــــ

يشربون شرب الهيم[۶۲] کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مدینہ اور کوفہ کے

۵۶ھ ہود : ۲۸ ؛ ۵۷ھ تفسیر الطبری، ۱۲ : ۱۸ مطبعہ امیریہ ؛
۵۸ھ صافات : ۱۰۲ ؛ ۵۹ھ تفسیر الطبری، ۲۳ : ۷۷، ۷۸ ؛
۶۰ھ الحجرات : ۱۴ ؛ ۶۱ھ تفسیر الطبری، ۲۶ : ۱۴۳ ؛ ۶۲ھ الواقعہ : ۵۵

بعض قرّاء نے "شُرْب" پڑھا ہے جبکہ مکّہ، شام، بصرہ کے بعض قرّاء نے "شَرْب" پڑھا ہے۔ وہ دونوں قرأتوں کو درست قرار دیتے ہیں[۶۳]

ابن جریر خود صاحبِ اجتہاد تھے اور دوسرے مجتہدین کے مذاہب سے بھی پوری طرح باخبر تھے۔ دورانِ تفسیر انہوں نے آیات سے مسائلِ فقہ کا استنباط کیا ہے کسی آیت کے بارے میں کسی خاص مکتبِ فکر کی رائے بیان کرنے کے بعد اپنی رائے بھی پیش کرتے ہیں۔ مثلاً آیت کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت[۶۴] کی تشریح میں کہتے ہیں کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر مرنے والے کے پاس دولت ہو تو وصیّت لازم ہے۔ عام مفسّرین کے برعکس وہ اس آیت کو سورۂ نساء کی اس آیت سے منسوخ نہیں سمجھتے جس میں اللہ تعالیٰ نے ورثاء کے حقوق خود متعیّن فرما دیئے ہیں۔ دونوں آیات میں مفہوم کو مشترک سمجھتے ہیں۔ اس طرح کہ آیتِ میراث کو عام ورثاء کے حق میں استعمال کیا جائے اور آیتِ وصیّت کو ان ورثاء کے لئے جن کو قانوناً حقِ میراث نہیں ملتا، حالانکہ وہ حاجت مند ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ جس طرح طاقت و قدرت کے باوجود روزہ کا تارک گنہگار ہوتا ہے۔ بعینہٖ قدرت کے باوجود وصیّت سے[۶۵] اعراض کرنے والا بھی گنہگار ہوگا۔

فمن شهد منكم الشهر[۶۶] کی تشریح کرتے ہوئے افطار کے مباح ہونے کے لئے بیماری کے تعیّن میں مختلف اقوال پیش کرتے اور پھر اپنا موقف بھی بیان کرتے ہیں:
والصواب عندنا أن المرض الذى أذن الله ذكره بالإفطار معه فى شهر رمضان من كان الصوم جاهده جهدا غير محتمل فكل من كان كذالك فله الإفطار وقضاء عدة من ايام أخر وذالك أنه اذا بلغ ذالك الأمر فان لم يكن ماذونا له فى الافطار فقد كلّف عسرا ومنع يسرا وذلك غير الذى أخبر الله أنه أراد بخلقه بقوله "يريد الله بكم اليسر ولا يريد بكم العسر" واما من كان الصوم غير جاهده فهو بمعنى الصحيح الذى تطيق الصوم فعليه أداء فرضه[۶۷] دورانِ سفر روزہ کے افطار اور عدمِ افطار

[۶۳] تفسیر الطبری، ۲۷ : ۱۹۵ ؛ [۶۴] البقرہ : ۱۸۰ ؛
[۶۵] تفسیر الطبری، ۲ : ۱۱۵ - ۱۱۶ ؛ [۶۶] البقرہ : ۱۸۵ ؛
[۶۷] تفسیر الطبری، ۲ : ۱۴۹ - ۱۵۰ ؛

کے بارے میں مختلف روایات کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں: ان الافطار رخصۃ لا عزیمۃ [۶۸]

فلا تحل له من بعد حتی تنکح زوجاً غیره [۶۹] کی تشریح میں مختلف اقوال ہیں کہ بعض نے اس سے مراد معاہدۂ نکاح اور بعض نے تعلقات لئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ زیرِ نظر آیت میں دونوں مفہوم ہی شامل ہیں۔ یہ مطلقہ شوہرِ اوّل کے لئے اسی وقت جائز ہو سکتی ہے جب کوئی دوسرا مرد اس عورت کے ساتھ نکاح صحیح کرے اور پھر تعلقات کے بعد اسے طلاق دے۔ یہی بات احادیث و اجماع سے ثابت ہے [۷۰]

ابن جریر علمِ کلام میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ وہ مختلف فرقوں اور اُن کے عقائد سے بخوبی باخبر تھے۔ اپنی تفسیر میں جابجا ان فرقوں کے غلط عقائد کی تردید اور متعلقہ مسئلہ میں اہلِ سُنّت کا مسلک بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے۔ فرقہ قدریہ کے عقیدۂ اختیار کی بڑی عمدگی سے تردید کی ہے اور اہلِ سُنّت کا مسلک واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کائنات میں تمام اُمور اللہ تعالیٰ کی مشیّت اور اذن سے انجام پاتے ہیں۔ آیت غیر المغضوب [۷۱] کی تشریح کرتے ہوئے فرقہ قدریہ کے عقیدہ کی غلطی کی نشاندہی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس آیت سے عقیدہ اختیار پر استدلال کرنا کلامِ عرب سے بھی ناواقفیت کا واضح ثبوت ہے [۷۲] وہ اسی طرح معتزلہ کے عقائد خلق قرآن، عدم رُؤیتِ الٰہی، مرتکب کبیرہ کے خلود نار وغیرہ کی مدلّل تردید کرتے اور اہلِ سنّت کا عقیدہ مع دلائل بیان کرتے ہیں۔ آیت: لا تدرکه الابصار وھو یدرك الابصار کی تشریح میں مختلف اقوال بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں: ان منکری الرؤیة لا یرجعون من قولھم الا الی ما لبس علیھم الشیطان مما یسھل علی اھل الحق البیان عن فساده وانھم لا یرجعون فی قولھم الی آیة من التنزیل محکمة ولا روایة عن رسول اللہ صحیحة ولا سقیمة فھم فی الظلمات یخبطون وفی العمیاء یترددون، ونعوذ باللہ من الحیرة والضلالة [۷۴]

---

[۶۸] تفسیر الطبری، ۲: ۱۵۵ ؛ [۶۹] البقرہ: ۲۳۰ ؛

[۷۰] تفسیر الطبری ۱: ۷۴ ؛ [۷۱] الفاتحہ: ۷ ؛

[۷۲] تفسیر الطبری ۱: ۷۴، [۷۳] الانعام: ۱۰۳ ؛ [۷۴] تفسیر الطبری

قالت الیھود ید اللہ مغلولۃ [۷۵]۔ کی تفسیر کرتے ہوئے معتزلہ کے عقیدہ تشبیہ و تجسیم میں ان کی غلطی کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور مختلف اقوال بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ یہاں ید اللہ سے مراد بخشیش اور انعامات ہیں۔ کلامِ عرب میں اس قسم کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں کہ جہاں انفاق کی صفت کو ہاتھ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ انفاق کا صدور بالعموم ہاتھ ہی سے ہوتا ہے[۷۶]۔ ابن جریر تفسیر میں اپنے زمانے کے تمام اختلافی و کلامی مسائل کو زیرِ بحث لاتے اور ان تمام میں سلف کا مسلک مع دلائل کے بیان کرتے ہیں۔

ابن جریر دورانِ تفسیر کسی آیت اور لفظ سے متعلق تمام روایات کا ذکر کر دیتے ہیں۔ لیکن وہ جو بھی روایت بیان کرتے ہیں۔ اس کی سند اور طرق بھی واضح کر دیتے ہیں۔ بعض اہلِ علم نے ضعیف روایات بالخصوص اسرائیلیات سے تفسیر کرنے پر ان کی تنقید کی ہے قالوا : إن سیاقہ للأخبار دون تمحیصہا أمر لا یلیق بالعالم الناقد البصیر[۷۷]۔ بعض دوسرے اہل علم نے ابن جریر پر لگائے گئے اس الزام کا جواب دیا ہے۔ اُن کا قول ہے کہ ابن جریر بعض اوقات ضعیف سند پر تنقید کرتے اور اُس کے سُقم کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔ مثلاً وہ اپنی تفسیر میں جب یہ روایت مَا کان النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم یفسر اشیاء من القرآن إلا آیات تعد علمہن إیاہ۔ جبریل بیان کرتے ہیں تو اس پر عدمِ اعتماد کا اظہار کر دیتے ہیں۔ لان راویہ ممن لا یعرف فی أھل الآثار وھو جعفر بن محمّد الزبیری[۷۸] اس کے علاوہ بھی وہ اپنی تفسیر میں متعدد مقامات پر سند کی صحّت پر عدمِ اعتماد کا اظہار کرتے ہیں[۷۹]۔ بعض کمزور روایتوں کے ذکر میں ابن جریر کا موقف بیان کرتے ہوئے احمد محمد شاکر فرماتے ہیں : انہ لم یجعل ھذہ الروایات قط مہیمنۃ علی کتاب اللہ الذی لا یأتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ وانہ اسناد لا تقوم بہ حجۃ فی دین اللہ ولا فی تفسیر کتابہ، وأن استدلالہ بہا کان یقوم مقام

---

[۷۵] المائدہ : ۶۴ ؛ [۷۶] تفسیر الطبری ۶ : ۲۹۹ ؛
[۷۷] مقدمہ تاریخ الطبری ص ۲۵ ؛ [۷۸] تفسیر الطبری ۱ : ۸۹ دار المعارف، مصر ؛
[۷۹] تفسیر الطبری ۱ : ۶۶-۷۷-۳۴۷-۳۴۸-۳۵۳-۳۵۴-۴۶۲-۴۵۲-۴۷۴

الاستدلال بالشعر القديم على فهم معنى كلمة أو بالدلالة على سياق جملة [۸۰]

ابن جریر خود مقدمہ تاریخ میں روایات کے ضمن میں اپنا موقف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ جو کچھ ہم تک پہنچا ہے، ہم اسے آگے پہنچادیں ادنیاه علی نحو ما أدی الینا [۸۱]

علامہ زرقانی ضعیف سند کے ذکر پر ابن جریر کو قابلِ مواخذہ نہیں سمجھتے کیونکہ ان عذره فی ذلك هو ذکر السند فی زمن تواقر الناس فيه على معرفة حال السند من غير توقف على تنبيه [۸۲] منہ۔ محمد حسین الذہبی کہتے ہیں کہ ابن جریر نے سند بیان کرکے اپنا فرض پورا کر دیا۔ اب یہ قاری کا فرض ہے کہ وہ سند کی جانچ پڑتال کرے: قد ذکر لنا السند بتمامه فی کل روایة یرویها، وبذلك یکون قد خرج من العهدة، وعلینا أن ننظر فی السند ونتفقد الروایات۔ [۸۳]

علامہ ابن جریر نے اسرائیلیات کے ضمن میں دو متضاد موقف اختیار کئے ہیں۔ ایک طرف تو وہ روایت کی تنقید میں شدت سے کام لیتے اور لایعنی باتوں کی تفصیل سے گریز کرتے ہیں مثلاً آیت: فقلنا اضربوه ببعضها [۸۴] کی تشریح میں مختلف روایات کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ علماء کا اس امر میں اختلاف ہے کہ مقتول کو گائے کے کس حصے سے مارا گیا تھا۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ اس بات کو جاننا ضروری نہیں: والصواب من القول عندنا فی تأویل قوله "اضربوه ببعضها" أن يقال امرهم الله شانه ان يضربوا القتيل ببعض البقرة يحيي المضروب، ولا دلالة فى الأية ولا خبر تقوم به حجة على أى أبعاضها التى امر القوم ان يضربوا القتيل به۔ [۸۵]

آیت: وانزل علینا مائدة من السماء [۸۶] کی تشریح میں انواع و اقسام کے طعام سے متعلق وارد مختلف قصص و روایات کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں:- وأما الصواب من القول فيما كان على المائدة فأن يقال كان عليها ماكول

---

[۸۰] تفسیر الطبری مقدمہ، ۱۶-۱۷ دارالمعارف مصر ؛ [۸۱] تاریخ الطبری مقدمہ ۱: ۸ دارالمعارف مصر ؛ [۸۲] مناہل العرفان ۱: ۴۹۷ ؛ [۸۳] التفسیر والمفسرون، ۱: ۲۱۲، ۲۱۵ ؛ [۸۴] بقرہ: ۷۳ ؛ [۸۵] تفسیر الطبری ۱: ۳۶۰ مطبع حلبی ؛ [۸۶] المائدہ: ۱۱۴ ؛

وجائز ان یکون کان سمکًا او خبزًا اوجائز ان یکون کان ثمرًا من ثمار الجنة وغیر نافع العلم به ولا ضار الجهل به اذا اقر تالی الاٰیة بظاہر ما احتمله التنزیل[۸۷]

آیت: وشروہ بثمن بخس دراہم معدودۃ[۸۸] کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ انہوں نے حضرت یوسف کو چند درہم کے عوض خریدا۔ قرآن وسنت میں ان کی تعداد اور وزن کا تعین نہیں ملتا، لہٰذا اس کے جاننے سے کوئی فائدہ اور لاعلمی سے دین میں کوئی نقصان نہیں پیدا ہوتا۔ لہٰذا آیت کے ظاہر پر یقین کرلینا کافی اور اس کے علاوہ تکلف ہے۔[۸۹]

دوسری طرف روایات وقصص کے ذکر میں تسامح برتتے ہیں اور بعض دفعہ ایسی روایات بھی بغیر نقد وتبصرہ کے بیان کرجاتے ہیں جو عصمتِ انبیاء کے منافی ہیں مثلاً آیت: ولقد فتنا سلیمان[۹۰] کی تفسیر کرتے وقت آیت سے متعلق جملہ روایات کا ذکر کرتے ہیں اور یہ تمام روایات جھوٹ کا پلندہ ہیں۔[۹۱]

آیت: فالقیٰ عصاہ[۹۲] کی تفسیر میں وہب بن منبہؒ سے ایسی روایت بیان کرتے ہیں جو اپنے سیاق وسباق کے اعتبار سے غریب[۹۳] ہے۔ علامہ ابن کثیر اس روایت کے بارے میں کہتے ہیں: وفیه غرابة فی سیاقه[۹۴]۔

تفسیر ابن جریر اس تسامح کے باوجود اپنی نوعیت کی واحد تفسیر ہے، جس پر متقدمین مفسرین نے اعتماد کیا ہے اور جس کو مشرق ومغرب میں یکساں مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ جیسا کہ معجم میں ہے: وقد حمل کتاب التفسیر شرقًا وغربًا وقرأہ کل من کان فی وقته من العلماء وکل فضله وقدمه[۹۵]۔

واٰخر دعوانا ان الحمد لله رب العٰلمین

---

۸۷ تفسیر الطبری، ۷: ۱۳۵ ÷ ۸۸ یوسف: ۲۴ ÷ ۸۹ تفسیر الطبری ۱۲ ÷ ۹۰ ص: ۳۴ ÷ ۹۱ تفسیر الطبری، ۲۳: ۱۰۰-۱۰۲ مطبعہ امیریہ
۹۲ الاعراف، ۱۰۷ ÷ ۹۳ تفسیر الطبری ۹: ۱۵ ÷
۹۴ تفسیر ابن کثیر، ۲: ۲۳۶ ÷ ۹۵ معجم الادباء، ۱۸: ۶۲ ÷

[بقیہ عرضِ احوال از صفحہ ۹] مکتوب مولانا وصی مظہر ندوی

محترم المقام ! زیدت عنایتکم   السلام علیکم ورحمۃ اللہ

۷ر جون کا تحریر کردہ مکتوبِ گرامی ۸ر جون کو موصول ہو گیا تھا۔ یہاں کے ایک مقامی مسئلہ میں اُلجھا ہوا تھا، اِس لئے جواب دینے میں تاخیر ہوئی !

مَیں آپ کا بیحد ممنون ہوں کہ آپ نے میرے عریضہ کو لائقِ جواب تصوّر فرمایا۔ درحقیقت یہ آپ کی خورد نوازی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ آمین !

مَیں اکتوبر ۷۵ء یا غالباً نومبر ۷۵ء میں جب آنجناب کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور مَیں نے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے بارے میں آپ کی رائے دریافت کی تھی تو آپ نے اجمالاً اُن کے بارے میں، میری یادداشت کے مطابق صرف دو اعتراضات بیان فرمائے تھے۔ ایک[۱] یہ اعتراض کہ وہ بہت کم علم رکھتے ہیں اور اس کم علمی کے باوجود وہ دعوتی کام کر رہے ہیں۔

دوسرا[۲] یہ اعتراض تھا کہ وہ اپنے جلسوں میں بھانت بھانت کے مولوی جمع کرتے ہیں۔ آپ نے بلاشبہ یہ بات فرمائی تھی کہ مَیں ڈاکٹر اسرار صاحب کے سامنے اپنی رائے بیان کروں گا۔ مگر چونکہ اجمالاً آپ نے اپنی رائے ظاہر فرما دی تھی۔ اور آپ دونوں حضرات غایت درجہ محبّت سے باہم گفتگو کر رہے تھے، لہٰذا مَیں نے اس مسئلہ کو چھیڑ کر کسی تکدّر کو پیدا کرنا مناسب نہ سمجھا۔

اِن شاءاللہ مَیں حاضر ہو کر بھی استفادہ کروں گا اور زیرِ ترتیب تصنیف سے بھی کماحقہٗ فائدہ اٹھاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ آپ کی صحت و توانائی کو "تدبّرِ قرآن" کی تکمیل میں صرف کرنے کے اسباب فراہم کرے اور دینی کام کرنے والوں کو غلط راہوں پر جانے سے بچائے۔ والسلام   احقر وصی مظہر

ان خطوط کے بارے میں جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ہم فی الحال کچھ عرض کرنا نہیں چاہتے البتہ مولانا اصلاحی کی خدمت میں یہ گذارش کرنے کو ضرور جی چاہتا ہے کہ بہتر یہی ہے کہ وہ اب بھی اپنے طرزِ عمل پر نظرِ ثانی فرمالیں۔ ورنہ اگر بات بڑھی تو قرآن مجید نہ صرف یہ کہ "لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ" کی رخصت عطا فرماتا ہے بلکہ "وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ" کا حکم بھی دیتا ہے !

(بقیہ … صفحہ)

لہٰذا اگر بات چل نکلی تو پھر اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کہاں تک پہنچے۔

اِس ضمن میں خدا شاہد ہے کہ راقم الحروف کو اصل فکر اپنی نہیں ہے، اِس لئے بھی کہ بفحوائے الفاظِ قرآنی : بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ ؕ اُسے خوب معلوم ہے کہ اس کے بارے میں مولانا اصلاحی کے تمام مُبیّنہ اندیشے بالکل بے اصل اور محض اُن کی قوّتِ متخیّلہ کی پیداوار ہیں اور جو جھنجھلاہٹ اُن پر طاری ہے، اُس کے اصل اسباب بالکل دوسرے ہیں ـــــ اور اس لئے بھی کہ اپنے بارے میں اسے، بحمداللہ کوئی مغالطہ لاحق نہیں ہے ــــ وہ کیا، اور اُس کی شخصیّت کیا، اور اس کی جرح کیا اور تعدیل کیا! ـــــ لہٰذا راقم کو تشویش ہے تو اِس کی کہ اگر معاملہ مولانا کی توقّع کے برعکس ہو گیا اور ع : "اِس عاشقی میں عزّتِ سادات بھی گئی!" کے مصداق اُلٹی اُن کی شخصیّت مجروح ہوگئی تو اِس سے تفسیر "تدبّرِ قرآن" کی ثقاہت (CREDIBILITY) کو شدید دھکّا لگے گا، جس کے بعض مقامات سے شدید اختلاف کے باوجود ہماری رائے ہے کہ بحیثیّتِ مجموعی وہ ایک بہت مفید کتاب ہے ـــــ اور اس سے اصل نقصان فکرِ فراہی کو پہنچے گا۔ اِس لئے کہ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے کم از کم پاکستان کی حد تک اس مکتبِ فکر کے واحد معروف نمائندے کی حیثیّت مولانا موصوف کو حاصل ہے۔

بنا بریں اپنے اُستاذِ مرحوم کے ساتھ نُصح و اخلاص اور خیر خواہی و وفاداری کا تقاضا بھی یہی ہے کہ مولانا اِس 'صلیبی جنگ' سے احتراز فرمائیں اور اپنے کام سے کام رکھیں اور دوسروں کو بھی جو مثبت کام وہ کر سکتے ہوں، کرنے دیں ــ باقی وہ اطمینان رکھیں کہ اوّل تو خود زمانہ بھی بہترین منصف ہے ـ وہ کسی بھی شخص کی اصل حقیقت کو زیادہ دیر تک چھُپا نہیں رہنے دیتا، بفحوائے الفاظِ قرآنی کہ : "فَسَتُبْصِرُ وَیُبْصِرُوْنَ بِاَیِّیْکُمُ الْمَفْتُوْنُ ۝" رہا اصل معاملہ، تو وہ اللہ کے ہاتھ ہے ہی، وہ ہر ایک کے ظاہر و باطن سے خوب واقف ہے ـ بقولہٖ تعالیٰ "اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِہٖ وَھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ ۝" وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ۝

لاہور میں مسجدِ شہداء میں روزانہ درسِ قرآن کا جو سلسلہ دو ماہ تک جاری رہا اُس کے باعث اس دوران میں باہر کہیں جانا نہ ہو سکا تھا۔ چنانچہ جون کا پورا مہینہ اس قرض کو اتارنے میں لگا ـ اور کراچی بھی جانا ہوا اور سکھر بھی اور راولپنڈی بھی اور واہ چھاؤنی بھی ـ ساتھ ہی

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ

اِس دارِ فانی میں جو بھی آتا ہے، جانے ہی کو آتا ہے۔ گویا دُنیا میں آنا بجائے خود جانے کی تمہید ہے۔ البتہ کچھ جانے والے اپنے پیچھے خوشگوار یادیں چھوڑ جاتے ہیں۔

جماعتِ اسلامی کے علقوں میں ابھی پروفیسر عبد الحمید صدیقی صاحب کی وفات کا زخم تازہ ہی تھا کہ جناب ماہر القادری بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ پروفیسر صاحب مرحوم ایک مرنجاں مرنج انسان اور سنجیدہ خاموش طالب علم تھے۔ جو ایک عرصۂ دراز سے پنجاب پبلک لائبریری کے ایک گوشے کی زینت بنے ہوئے تھے ـــــ جب کہ ماہر صاحب ایک باغ و بہار شخصیت اور رونقِ بزمِ شعر و سخن تھے۔ اللہ دونوں کی مغفرت فرمائے اور دونوں کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

ماہر صاحب اور راقم الحروف کے مابین اگرچہ بعض مواقع پر قلمی تلخ کلامی بھی ہوئی۔ تاہم راقم کو اُن کے توحید کے ساتھ ذہنی وقلبی لگاؤ کا ہمیشہ اعتراف رہا۔ اور گذشتہ سال اتفاقاً اُن کی شخصیت کا ایک اور پہلو بھی سامنے آیا، جس سے دل میں اُن کی قدر کا اضافہ ہوا۔ اور وہ اس طرح کہ مولانا ظفر احمد انصاری اور ماہر صاحب لاہور میں مرحوم ذکی کیفی صاحب کے مکان پر مقیم تھے۔ راقم مولانا انصاری صاحب سے ملنے ایک دو بار وہاں گیا۔ تو ماہر صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ پھر جب راقم نے مولانا انصاری کو اپنے یہاں کھانے کی دعوت دی تو ساتھ ہی ڈرتے ڈرتے ماہر صاحب کی خدمت میں بھی گذارش پیش کی۔ جسے انہوں نے نہایت خندہ پیشانی سے بغیر کسی ردّ و قدح یا تکلّف کے قبول فرما لیا۔ چنانچہ وہ تشریف لائے، ماحضر تناول فرمایا۔ اور پوری بے تکلّفی اور کامل ذوق وشوق کے ساتھ اپنی بعض مشہور نظمیں بھی پڑھ کر سنائیں، جنھیں بچّوں نے ٹیپ پر محفوظ کر لیا۔ ماہر صاحب کی اِس دل کی صفائی اور طبیعت کی سادگی سے طبیعت بہت متاثّر ہوئی۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَهٗ وَارْحَمْهُ۔

اِدھر سکھر میں راقم کے ایک دیرینہ معاون و رفیق کار میاں عبد اللطیف صاحب انتقال فرما گئے۔ موصوف بھی جماعتِ اسلامی کے سابق ارکان میں سے تھے، اور ان سے ۵۶-۵۷ء ہی سے شناسائی تھی۔ چند سال سے وہ سکھر میں راقم کے دروسِ قرآن وغیرہ کے اہتمام میں پورے

تھے۔ کچھ عرصے سے عارضۂ قلب میں مبتلا تھے اور اِن دنوں بغرضِ علاج کوئٹہ جانے کی سوچ ہی رہے تھے کہ راقم کے دورۂ سکھر کا پروگرام بن گیا۔ چنانچہ اس کے لئے رُک گئے لیکن جب راقم ۱۹ جون کی صبح سکھر کے ہوائی اڈے پر اُترا تو پہلی خبر جو رفیق مکرّم نجیب صدیقی صاحب نے سُنائی، وہ یہ تھی کہ رات لطیف صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ؀ چنانچہ اُسی روز نمازِ مغرب کے بعد راقم نے اُن کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ مرحوم چونکہ ایک معروف سماجی کارکن بھی تھے لہٰذا نمازِ جنازہ میں نہایت کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی اور راقم نے اس موقع پر مختصر خطاب بھی کیا۔ اس موقع پر بعض احباب نے یہ بھی فرمایا کہ کاش ڈاکٹر صاحب اسی طرح ہمارے انتقال پر بھی پہنچ جائیں۔ جس پر راقم نے عرض کیا کہ کیا عجب اگلا نمبر میرا ہی ہو اور آپ لوگ میرے جنازے پر تشریف لائیں۔ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا ؕ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ

مرحوم کے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ کئی بچیاں ہیں اور بچہ صرف ایک اور وہ بھی ابھی نابالغ! اللہ تعالیٰ مرحوم کی خطاؤں سے درگذر فرمائے، اور انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر بھی عطا فرمائے، اور اُن کے جملہ مسائل بحسن وجوہ حل فرمائے۔ مرحوم کی آخری یادگار ایک خط ہے جو انہوں نے نجیب صدیقی صاحب کی "ہم نوائی" یا "ہم قلمی" میں مولانا اصلاحی صاحب کے نام لکھا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ بھی کسی موقع پر ہدیۂ ناظرین ہو جائے!

لاہور میں گذشتہ ہفتے کرنل ڈاکٹر سلامت اللہ صاحب بانی ادارہ "دارالسّلام" باغِ جناح بھی اچانک انتقال فرما گئے۔ مرحوم ایک معروف دینی و سماجی کارکن تھے۔ قرآن مجید سے انہیں والہانہ لگاؤ بلکہ عشق تھا۔ انگریز کے زمانے میں اپنی ملازمت کے سلسلہ میں جہاں بھی تعینات ہوتے اپنے گھر پر ہفتہ وار درسِ قرآن کی نشست کا اہتمام ضرور کرتے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد اُن ہی کی تحریک و تجویز پر باغِ جناح لاہور (اُس وقت لارنس گارڈن) میں نماز کے لئے بنے ہوئے ایک چبوترے پر ہر اتوار کی صبح مولانا محمد علی قصوری مرحوم نے درسِ قرآن دینا شروع کیا تھا۔ پھر ان ہی کی کوشش و ہمت اور جرأت و مردانگی تھی کہ تمام موانع و مشکلات کے باوصف اس چبوترے نے نہایت خوبصورت مسجد کی صورت اختیار کر لی۔ جب سے راقم نے لاہور میں درس و تدریسِ قرآن کا کام شروع

افسوس کہ راقم کی مجبوریاں حائل ہوتی رہیں۔ ایک زمانے میں کرنل صاحب کے اصرار پر راقم نے ہر اتوار کی شام کو مسجد دار السّلام میں ہفتہ وار درس کا آغاز کر بھی دیا تھا جو کچھ عرصہ جاری رہا، لیکن جلد ہی عدمِ فرصت کی وجہ سے منقطع ہو گیا۔ البتہ اس کے بعد بھی ایک عرصہ تک راقم کے ایک رفیقِ کار مختار حسین فاروقی صاحب وہاں ہفتہ وار درس دیتے رہے اور جمعہ سے قبل خطاب بھی کرتے رہے۔۔ اب اتفاق سے ایسی صورت پیدا ہوئی کہ راقم نے خطبۂ جمعہ و درسِ قرآن کا مستقل سلسلہ مسجد دار السّلام میں شروع کیا تو جلد ہی مرحوم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ اللہ تعالیٰ اُن کی خطاؤں سے درگزر فرمائے اور اُن کی مغفرت فرمائے، اور اُن کی سعادت مند اولاد اور ادارہ دار السّلام میں اُن کے رفقاءِ کار و معاونین کو توفیق عطا فرمائے کہ اُن کے صدقۂ جاریہ یعنی دار السّلام لائبریری اور مسجد کا انتظام و انصرام اُن کی خواہش کے مطابق بااحسن وجوہ کرتے رہیں۔

عجیب حُسنِ اتفاق ہے کہ کرنل صاحب مرحوم نے بھی حال ہی میں ایک خط راقم کو لکھا تھا۔ یہ راقم کے نام اُن کا پہلا اور آخری خط ہے، اس لئے کہ ایک شہر میں رہتے ہوئے خط و کتابت کی کبھی حاجت ہی محسوس نہ ہوئی۔ اپنے اس خط میں جو کرنل صاحب مرحوم نے ۲۶ مئی کو لکھا تھا، انہوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کیا تھا کہ "خدا کرے کہ آپ اس مسجد کی خدمت تادیر سرانجام دے سکیں!" اور ساتھ ہی یہ الفاظ بھی تحریر کئے تھے کہ "میری زندگی اب قریبِ اختتام ہے!" یہ آخری بات اگرچہ اُن کی عمر کے اعتبار سے زیادہ بعید از قیاس نہ تھی تاہم یہ ہرگز اندازہ نہ تھا کہ اِس تحریر کے ایک ہی ماہ بعد اُن کا انتقال ہو جائے گا۔ بہرحال اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

بقیہ عرضِ احوال صفحہ ۶۵ سے آگے

اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی صورت پیدا فرما دی کہ پاکستان کے شمالی علاقوں کی ایک بھرپور سیر کا بندوبست ہو گیا۔ چنانچہ گلگت اور ہنزہ کے علاقوں کی تفصیلی سیر بھی ہوئی اور تازہ تعمیر شدہ شاہراہِ ریشم کے اکثر حصے پر بھی سفر کا موقع مل گیا۔ اِس سفر میں اللہ تعالیٰ کی جو شانیں مشاہدے میں آئیں اُن کا ذکر الفاظ میں ممکن نہیں۔

یکم جولائی سے حسبِ سابق قرآن اکیڈمی میں پہلا ایک ماہی تدریسی کورس جاری ہے۔ روزانہ تقریباً چار گھنٹے کی تدریس کے بعد اگرچہ جسم سے جان تو بالکل نکل سی جاتی ہے۔ البتہ دل کو ہر درجہ اطمینان رہتا ہے کہ زندگی کے یہ اوقات مفید مصرف میں صرف ہو رہے ہیں۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ

کا ایک سبق آموز واقعہ

بروایت مولانا مفتی محمد شفیعؒ

"عوامی درسِ قرآن"

کی ضرورت و اہمیت

ماخوذ از "وحدت اُمت" ـــــــ تالیف مولانا مفتی محمد شفیعؒ

شائع کردہ ـــ مکتبہ المنبر ـــ لائل پور

"شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہٗ مالٹہ کی چار سالہ جیل سے رہائی کے بعد دارالعلوم دیوبند میں تشریف لائے تو علماء کے ایک مجمع کے سامنے آپ نے بہت اہم بات ارشاد فرمائی۔

جو لوگ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے واقف ہیں وہ اس سے بھی بے خبر نہیں ہیں کہ ان کی یہ قید و بند عام سیاسی لیڈروں کی قید نہ تھی۔ جنگ آزادی میں اس درویش کی ساری تحریکات صرف رضائے حق سبحانہ' و تعالےٰ کے لئے امت کی اصلاح و فلاح کے گرد گھومتی تھیں۔ مسافرت اور انتہائی بےکسی کے عالم میں گرفتاری کے وقت جملہ جو انکی زبان مبارک پر آیا تھا، ان کے عزم اور مقصد کا پتہ دیتا ہے فرمایا "الحمد للہ بمصیبتے گرفتارم نہ بمعصیتے"۔ جیل کی تنہائیوں میں ایک روز بہت مغموم دیکھ کر بعض رفقاء نے کچھ تسلی کے الفاظ کہنا چاہیے تو فرمایا "اس تکلیف کا کیا غم ہے جو ایک دن ختم ہو جانے والی ہے، غم اس کا ہے کہ یہ تکلیف و محنت اللہ تعالیٰ کے نزدیک قبول

ہے یا نہیں ؟"

مالٹہ کی قید سے واپس آنے کے بعد ایک رات بعد عشاء دارالعلوم میں تشریف فرما تھے، علماء کا بڑا مجمع سامنے تھا، اس وقت فرمایا کہ "ہم نے تو مالٹہ کی زندگی میں دو سبق سیکھے ہیں" یہ الفاظ سن کر سارا مجمع ہمہ تن گوش ہوگیا کہ اس استاذ العلماء درویش نے اسی سال علماء کو درس دینے کے بعد آخر عمر میں جو سبق سیکھے ہیں، وہ کیا ہیں - فرمایا کہ

" میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا، دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی، اس لئے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کر دوں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے بچوں کے لئے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر بستی بستی میں قائم کئے جائیں - بڑوں کو عوامی درس قرآن کی صورت اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لئے آمادہ کیا جائے، اور مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے"۔

نباضِ اُمت نے ملت مرحومہ کے مرض کی جو تشخیص اور تجویز فرمائی تھی، باقی ایامِ زندگی میں ضعف وعلالت اور ہجومِ مشاغل کے باوجود اس کے لئے سعی پیہم فرمائے بذاتِ خود درس قرآن شروع کرایا، جس میں تمام علمائے شہر اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی جیسے علماء بھی شریک ہوتے تھے اور عوام بھی، اس ناکارہ کو اس درس میں شرکت کا شرف حاصل رہا ہے - مگر اس واقعے کے بعد حضرت رح کی عمر ہی گنتی کے چند ایام تھے -

"آن قدح بشکست وآں ساقی نماند"

آج بھی مسلمان جن بلاؤں میں مبتلا اور جن حوادث وآفات سے دوچار ہیں اگر بصیرت سے کام لیا جائے تو ان کے سب سے بڑے سبب یہی دو ثابت ہوں گے - قرآن کو چھوڑنا اور آپس میں لڑنا ــــ غور کیا جائے تو یہ آپس کی لڑائی بھی قرآن کو چھوڑنے ہی کا لازمی نتیجہ ہیں - قرآن پر کسی درجے میں بھی عمل ہوتا تو خانہ جنگی یہاں تک نہ پہنچتی "

اسلام، مسلمان اور قرآن حکیم

اشعار اقبال کی روشنی میں

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر!

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

یا آیاتش ترا کارے جز ایں نیست
کہ از یٰسینِ اُو آساں نمیری

◉

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی
اے چُوں شبنم بر زمیں افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندۂ

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست او
زندہ و پائندہ و گویاست اُو!

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود!

◉

جُز بہ قرآں ضیغمی روباہی است
فقرِ قرآں اصلِ شاہنشاہی است

فقرِ قرآں اختلاطِ ذکر و فکر
فکر را کامل نہ دیدم جُز بہ ذکر

مِلّت کے ایک اور عظیم فرزند

مولانا ابُوالکلام آزاد مرحوم

کی رائے جو اس دور میں ظاہر ہوئی جب وہ جمیع اسلامیانِ ہند کی آنکھ کا تارا تھے اور انہوں نے ابھی انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت اختیار نہ کی تھی:

"اگر ایک شخص مسلمانوں کی تمام موجودہ تباہ حالیوں اور بدبختیوں کی علّتِ حقیقی دریافت کرنا چاہے اور ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دے کہ صرف ایک ہی علّتِ اصلی ایسی بیان کی جائے جو تمام علل و اسباب پر حاوی اور جامع ہو۔ تو اس کو بتایا جا سکتا ہے کہ علماءِ حق و مرشدینِ کاملین کا فقدان اور علماءِ سُوء و مفسدین دجّالین کی کثرت ـــــ رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَ نَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ۝

اور پھر اگر وہ پوچھے کہ ایک ہی جملہ میں اس کا علاج کیا ہے؟ تو اس کو امام مالک کے الفاظ میں جواب ملنا چاہیئے کہ "لا یصلح اٰخر ھٰذہِ الْاُمَّۃِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِہٖ اَوَّلُھَا" یعنی اُمّتِ مرحومہ کے آخری عہد کی اصلاح کبھی نہ ہو سکے گی، تاوقتیکہ وہی طریق اختیار نہ کیا جائے جس سے اس کے ابتدائی عہد نے اصلاح پائی تھی اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ قرآن حکیم کے اصلی و حقیقی معارف کی تبلیغ کرنے والے مرشدین صادقین پیدا کیے جائیں۔"

مولانا ابوالکلام آزاد

ماخوذ از "البلاغ" جلد اوّل شمارہ اوّل مورخہ ۱۲ر نومبر ۱۹۱۵ء

یکم جون ۱۹۷۸ء سے

لاہور میں

ڈاکٹر اسرار احمد

صدر مؤسس، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

وامیر تنظیم اسلامی

کے ہفتہ وار

دروسِ قرآن

و خطاباتِ عام

کا پروگرام:

(۱)

مسجد شہداء، ریگل چوک

میں

ہر بُدھ کو بعد نمازِ عصر!

ماہ جون و جولائی کے دوران یہ درس عصر سے مغرب اور پھر مغرب سے عشا
تک جاری رہے گا — اور اس میں

"مطالعۂ قرآن حکیم کے منتخب نصاب"

کے بقیہ حصص کا درس ہوگا!

بعد ازاں

اسی مسجد میں آغاز سے تسلسل کے ساتھ درسِ قرآن کا جو سلسلہ اس سے قبل
جاری تھا اور جس میں بحمداللہ قرآن مجید کے پہلے سات پاروں کا درس مکمل ہو چکا
وہ دوبارہ جاری ہو جائے گا — اور ان شاء اللہ العز

بدھوار، ۹۔ اگست ۷۸ء مطابق ۴۔ رمضان المبارک

کو قرآن حکیم کے آٹھویں پارے کا درس

شروع ہو جائے گا

مسجد دارالسلام، باغِ جناح

میں

ہر جمعہ کو ۱۰ بجے صبح تا ۱۲ بجے دوپہر!

قرآن مجید کے مسلسل درس کا جو سلسلہ مسجد خضراء، سمن آباد میں جاری تھا اور جس میں

بحمداللہ قرآن مجید کے ساڑھے سترہ پاروں کا درس

مکمّل ہو چکا ہے، آگے تسلسل کے ساتھ جاری رہے گا، —— چنانچہ

جمعہ ۲ جون کو سُورۃ نور کے پہلے رکوع کا درس

دوبارہ ہوگا اور اس کے بعد کوشش ہوگی کہ پابندی اور قدرے تیز رفتاری کے ساتھ
ڈاکٹر صاحب کے قرآن حکیم کے درس کا یہ پہلا دَور جلد مکمّل کر لیا جائے!

نیز اسی مسجد میں ڈاکٹر صاحب

خُطبۂ جُمُعہ

بھی دیں گے جو پورے ساڑھے بارہ بجے شروع ہوگا؛

اور نمازِ جمعہ، ان شاء اللہ، ٹھیک سوا بجے ادا کی جائے گی!

ماڈل ٹاؤن لاہور

کے دس بلاکوں کی جامع مساجد میں

"سیرتُ النبیؐ اور سیرِ خلفاءِ راشدینؓ"

کے موضوع پر دس تقاریر کے سلسلے کی تکمیل کے بعد ——— اِن شاء اللہ

از ۱۶ جون تا ۴ اگست ہر جمعہ کو بعد نماز مغرب

مختلف بلاکوں کی جامع مساجد میں خطابات عام کا ایک اور دور مکمل کیا جائے گا جن میں:

۱۔ مطالبِ اُمّ القرآن ——— یعنی سورۃ فاتحہ!

۲۔ اسلام میں عبادت کا تصوّر ——— !

۳۔ صلوٰۃ ——— اور اس کی اہمیّت!

۴۔ صوم ——— اور اس کی عظمت!

۵۔ زکوٰۃ ——— اور اس کی حکمت!

۶۔ حجّ ——— اور اس کی جامعیت!

ایسے اہم اور اساسی موضوعات پر گفتگو ہو گی!

دورانِ رمضان مبارک یہ سلسلہ لامحالہ بند رہے گا اور اِن شاء اللہ

جمعہ ۸ ستمبر ۷۸ء سے قرآن اکیڈمی

واقع ۳۶ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور میں

ڈاکٹر اسرار احمد

امیر تنظیم اسلامی

و صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کی حسب ذیل تالیفات دستیاب ہیں ۔

— ۱ —

مطالبات دین

□ عبادت رب □ شہادت علی الناس اور □ اقامت دین

کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب کے تین خطابات کا مجموعہ

بڑے سائز کے ۱۲۸ صفحات ۔ سفید کاغذ ۔ آفسٹ طباعت قیمت : چھ روپے

شائع کردہ : مکتبہ تنظیم اسلامی (فون : ۳۵۲۶۸۳)

— ۲ —

نبی اکرم کا مقصد بعثت

اور

انقلاب نبوی کا اساسی منہاج

بڑے سائز کے ۳۶ صفحات ، سفید کاغذ ، آفسٹ طباعت قیمت : تین روپے

— ۳ —

مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب

ہدیہ نصف اول ۵ روپے ۔ نصف دوم ۵ روپے

شائع کردہ : مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

فون : ۳۵۲۶۱۱

Regd. L. No. 7360

Monthly MEESAQ Lahore

Volm. 27 | JULY 1978 | No. 7

ایک ——— ضروری ——— وضاحت

تنظیم اسلامی

کے ——— دستور ——— کی

ایک عبارت کے بارے میں بعض حضرات نے یہ خیال ظاہر فرمایا ہے کہ اس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ جن انبیاء و رسل علیہم السلام کے نام قرآن میں مذکور ہیں ان کے سوا اور کوئی نبی یا رسول دنیا میں مبعوث نہیں ہوئے۔ اس بحث سے قطع نظر کہ اس عبارت سے یہ مفہوم اخذ کرنا درست ہے یا نہیں ہم اولین فرصت میں اس سے اظہار براءت کرنا ضروری سمجھتے ہیں اس لئے کہ کوئی مسلمان اس خیال کا حامل ہو ہی نہیں سکتا۔ اصل میں اس عبارت کا مقصود یہ ہے کہ ان انبیا و رسل کے علاوہ جن کے نام قرآن میں آ گئے ہیں کسی اور شخص معین کو یقین کے ساتھ نبی یا رسول قرار نہیں دیا جا سکتا جیسے کہ بعض حضرات نے کرشن جی وغیرہ کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ نبی تھے۔ بہر حال عبارت میں اگر کوئی ابہام ہے تو اسے ان شاء اللہ اگلے ایڈیشن میں درست کر دیا جائے گا تا کہ کسی مغالطے کی گنجائش نہ رہے۔

المعلن : (شیخ) جمیل الرحمٰن ، ناظم عمومی ، تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد (ناشر) نے باہتمام چوہدری رشید احمد (طابع) مکتبہ جدید پریس شارع فاطمہ جناح سے چھپوا کر مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی ، ۳۶ - کے ، ماڈل ٹاؤن ، لاہور سے شائع کیا۔